تذکرہ علی بن عثمان ہجویریؒ

حالات و تعلیمات داتا گنج بخشؒ کا مستند مجموعہ

تالیف

نسیم چوہدری

المعارف ○ گنج بخش روڈ، لاہور

بسم الله الرحمن الرحیم

نحمده و نصلی علی رسوله الکریم

[illegible]

[illegible]

خاک یثرب از دم او زنده است

صبح ما از مهر او تابنده است

دکتر علامه محمد اقبال مرحوم

حرره نفیس حسینی غفرله

تذکرہ علی بن عثمان ہجویری رحمۃ اللہ علیہ

حالات و تعلیمات داتا گنج بخشؒ کا مستند مجموعہ

مصنّف
نسیم چوہدری
ایڈمنسٹریٹر دربار داتا صاحبؒ

المعارف گنج بخش روڈ لاہور

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No: 074260
★ MAILSI ★

جملہ حقوق محفوظ

بار اول ——— ۱۳۹۴ھ

تعداد ——— ایک ہزار

طباعت ——— آفسٹ طباعت آفسٹ کاغذ

ضخامت ——— ۱۸×۲۳/۸ ۱۶۰ صفحات

طابع ——— مکتبہ جدید پریس۔ لاہور

ناشر ——— المعارف۔ لاہور

قیمت ——— مجلد پندرہ روپے

یکے از مطبوعات

المعارف
گنج بخش روڈ
لاہور
تصوف کی بہترین کتابیں پیش کرنے والا ادارہ

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

Masood Faisal Jhandir Library

6021

الحاج چودھری ممتاز احمد کاہلوں
وزیر اوقاف
پنجاب
کے
نام

فہرست

تعارف	۹
اسم گرامی	۱۵
وطن مالوف	۱۸
ولادت	۲۴
کنیت	۲۶
لقب	۲۸
شجرۂ نسب	۳۲
تحصیلِ علم	۳۴
سلسلۂ بیعت	۴۱
حضرت مخدومؒ کے اساتذہ	۴۷

ورودِ لاہور	۵۱
حضرت مخدوم اور تبلیغِ دین	۷۰
ازدواج	۸۰
سالِ وصال	۸۶
مدفن	۱۰۴
تعمیر و توسیع	۱۱۰
تصانیف	۱۱۵
اردو ترجمہ کشف الاسرار	۱۳۷
کتابیات	۱۵۳

تعارف

آج سے کوئی ایک ربع کم ایک ہزار سال پہلے خاکِ لاہور کو حضرت داتا گنج بخشؒ نے قدم بوسی کا شرف بخشا۔ ان ایام سے لے کر تا بامروز اس شہر کا وہ گوشہ جہاں آپ نے رختِ اقامت ڈالا اور جسے بعد میں آپ کا مدفن کہلانے کی سعادت نصیب ہوئی مرجع خلائق چلا آ رہا ہے۔ زمانہ کے دستبرد کے عادی ہاتھوں نے اگرچہ بعض کڑیاں ہم سے چھین کر سلسلہ مربوط اور مسلسل نہیں رہنے دیا لیکن قیاس قوی یہی ہے کہ ہر دور میں آپ کی ذات اور آپ کے حالات میں لوگوں نے اپنی دلچسپی کا اظہار قلمی آثار کی صورت میں کیا ہوگا کیونکہ آپ بیک وقت عالم بھی تھے عارف بھی تھے اور فلسفی بھی تھے۔ اسی لیے کشف المحجوب میں علم و عرفان و فلسفہ کے خزانے پوشیدہ ہیں صدیوں سے ہر کوئی اپنے اپنے ظرف اور اپنی اپنی ضرورت کے مطابق اس سے متمتع ہو رہا ہے

نسیم صاحب کی یہ تالیف بھی داتا صاحب کے ایک ایسے ہی عقیدت مند کی تحدیثِ نعمت ہے لیکن طلب و تلاش چونکہ عقیدت کا خاصا ہے اس لیے اسے دشتِ تجسس میں سعی و جستجو بھی کہا جا سکتا ہے۔ حضرت مخدومؒ کے سوانح حیات کئی اور نامور ہستیوں کی طرح اس تفصیل کے ساتھ اہلِ طلب و ذوق کے سامنے نہیں آ رہے جو ان کے درخور مقام ہیں۔ تحقیق طلب باتیں تاہنوز تحقیق طلب ہیں اور اس کے

باوجود کہ ان میں سے بیشتر کی حیثیت فروعی ہے دلِ عقیدت مند کی آرزو ہمیشہ یہی رہی ہے کہ اس سلسلہ میں جو اڑچنیں پڑی ہوئی ہیں وُہ دور ہو جائیں اور اپنے اپنے جذبۂ عقیدت کے زیرِ اثر ہر کوئی گرہ ہائے ناکشودہ کو کھولنے میں ناخنِ فکر و عقل سے کام لیتا آیا ہے۔

تعارفی سطور لکھنے کی غرض سے جب میں نے اس مسوّدہ کو پڑھا تو اس کے اوراق میں بھی جگہ جگہ اسی اضطراب و اخلاص عقدہ کشائی کی جھلک پائی۔

نسیم صاحب اس سے پہلے ایک کتاب حضرت شاہ دولہ صاحب کے متعلق لکھ کر اربابِ باطن سے اپنی وابستگی کا ثبوت دے چکے ہیں۔ وہ کتاب انہوں نے گجرات میں اپنے قیام کے دوران مکمل کی تھی اور گجرات کے اس مشہور صاحبِ کرامات عارف پر غالباً اپنی نوعیت کی پہلی کتاب تھی۔ موجودہ تصنیف کی داغ بیل بھی انہوں نے ہرچند گجرات ہی میں ڈالی تھی اور یہ مسوّدہ لاہور آنے سے پہلے مکمل ہو چکا تھا لیکن حسنِ اتفاق کہ اس کی اشاعت کے وقت مولف کو مرکزِ تجلّیات کی کشش اپنے بالکل قریب لے آئی ہے۔

اپنی نوع کے دُوسرے مجموعوں میں سے جو چیز اس کتاب کو منفرد کرتی ہے وُہ یہ ہے کہ اس میں پہلی بار کشف الاسرار کا اُردو ترجمہ بہتر صورت میں شائع کیا گیا ہے۔ کشف الاسرار بلاشبہ ایک متنازعہ کتاب ہے اور بعض لوگ اسے الحاقی گنتے ہیں۔ ڈاکٹر ظہور الدین احمد صاحب نے اپنی تصنیف "پاکستان میں فارسی ادب" میں اور حال ہی میں حکیم محمد مُوسیٰ امرت سری صاحب نے کشف المحجوب اُردو ترجمہ نسخۂ سمرقند کے دیباچہ میں تو اس پر اصرار کیا ہے کہ یہ حضرت مخدومؒ کی تصنیف نہیں ہے لیکن ان تمام شواہد کو وقتی طور پر تسلیم کر لینے کے باوجود جو حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب نے کشف الاسرار کے جعلی ہونے کی دلیل میں پیش کیے ہیں بعض شواہد ایسے بھی ہیں جن کی بنا پر خود ڈاکٹر صاحب کو بھی کشف الاسرار

پر حضرت مخدومؒ کی تصنیف کا گمان ہوتا ہے اور چونکہ اُن سے منسوب اس نام کی تصنیف کا ذکر تذکروں میں آرہا ہے اس لیے اسے داتا صاحب ہی کی تصنیف یا فوائد الفواد کے انداز میں تحدیث مان لینا نامناسب نہیں ہے اور اس باب میں قطعی فیصلہ جیسا کہ نسیم صاحب کا خیال ہے مستقبل پر چھوڑ دینا چاہیئے، اس لیے بھی کہ کشف الاسرار پر کیے گئے اعتراضات میں سے بعض ایسے ہیں جن سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے مثال کے طور پر حکیم صاحب نے "معشوق بگزیں وجان خود را فدای او کن و بگو کہ اگر جان در راہ او فدا شود بہ است" نقل کرنے کے بعد کشف المحجوب کی یہ عبارت نقل کی ہے "من کہ علی بن عثمان الجلابی ام از پس آنکہ حق تعالیٰ مرا یازدہ سال از آفت تزویج نگاہ داشتہ بود ہم بہ تقدیر وی بفتنہ اندر افتادم وظاہر و باطنم اسیر صفتی شد کہ با من کردن بی آنکہ رویت بود و یک سال مستغرق بودم چنانکہ نزدیک بود کہ دین بر من تباہ شود تا حق تعالیٰ بہ کمال لطف و تمام فضل خود باستقبال دل بیچارہ من فرستاد و بہ عصمت خلاصی ارزانی داشت والحمد للہ علی جزیل نعماتہ" اور پھر لکھا ہے کہ "حضرت داتا صاحبؒ عشق مجازی سے نجات پر خدا کا شکر بجا لا رہے ہیں اس لیے کہ اس میں دین کے تباہ ہونے کا خطرہ تھا مگر صاحبِ کشف الاسرار معشوق پر فدا ہونے کی تلقین کر رہا ہے"۔ جہاں تک راقم الحروف سمجھ سکا ہے کشف الاسرار کی اس عبارت میں معشوق حقیقی مراد ہے اس لیے اس کے مقابل "آفت تزویج" والی عبارت لے آنا تکلف محض ہے۔ حکیم صاحب کو خود بھی اس کا احساس تھا اس لیے انہوں نے اس سطر کا اضافہ کر دیا کہ "اگر اس سے عشقِ حقیقی مراد ہو تو بھی یہ داتا صاحب کا اندازِ بیان نہیں ہے"۔ ظاہر ہے کہ یہ سطر فتویٰ ہے دلیل نہیں ہے لیکن جہاں حکیم صاحب کی اس مختصر سی عبارت میں کتابت کی غلطیاں اور فروگزاشتیں

ورآ سکتی ہیں وہاں صدیوں کا فاصلہ بات کو جہاں تک بھی پہنچا دے ممکن ہے۔ کشف المحجوب سے نقل کردہ عبارت میں جو یہاں حکیم صاحب کے دیباچہ سے نقل کی گئی ہے کردند کو کردن لکھا گیا ہے اور" باستقبال" سے پہلے" عصمت را" کتابت ہونے سے رہ گیا ہے چنانچہ نقل شدہ عبارت سے پتہ نہیں چلتا کہ" فرستاد" کا اشارہ کس طرف ہے قلمی کتابیں اس قسم کی فروگزاشتوں سے بہت کم خالی تھیں اور بعد کے لکھنے والوں نے اپنی اپنی سوچ کے مطابق خانہ پُری کی جس سے مطلب غت ربود ہوتا رہا۔ اسی عبارت میں لفظ کا بفتہٗ ہونا بھی اسی قدر ممکن ہے جس قدر صفت کا صنعت ہونا۔ اور یہی وجہ ہے کہ بعض مترجمین نے اس کا ترجمہ صفت سمجھ کر کیا ہے اور بعض نے صنعت جان کر۔ جس طرح بعض نے جلابی اور بعض نے جلالی جانا اور قیاس کی اپنی اپنی راہ پر چل پڑے بلکہ وُہ بھی ہیں جو اس لفظ کو جلانی (یعنی گیلانی) سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کشف الاسرار میں حضرت مخدومؒ کے اپنے آپ کو یُوسف کنعانی کہنے پر اعتراض کیا ہے کہ اس سے غرور کی بُو آتی ہے حالانکہ یہاں یُوسف کنعان میں غریب الوطنی اور" درمیان ناجنساں گرفتار شدہ بودم" والی کیفیت کی طرف لطیف سا اشارہ ہے۔ کشف الاسرار میں" نواحی لاہور را جنت مثال یافتم" کو حکیم صاحب نے" من اندر دیار ہند در بلدہ لہانور کہ از مضافات ملتان است درمیان ناجنساں گرفتار شدہ بودم" کے اُلٹ جانتے ہوئے لکھا ہے کہ داتا صاحب لاہور کو جنت مثال کیونکر لکھ سکتے تھے لیکن جب تک یہ عقدہ کھل نہیں جاتا کہ داتا صاحب لاہور ایک بار آئے یا دو بار اس وقت تک کسی ایک رائے کے حق میں دوسری رائے کا در بند نہیں کیا جا سکتا، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ پہلی بار وُہ اس لہانور میں آئے ہوں جسے بشیر احمد سعدی نے ملتان کے قریب ایک گاؤں بتایا ہے اور کہا ہے کہ گاؤں کا

نام بہنور ہے جسے کاتبوں نے لہنور اور پھر لہانور لکھا اور زاں لبعد اسے لاہور ہی سمجھ لیا گیا اور اگر سعدی صاحبؒ کی بات مان لی جائے تو ممکن ہے دوبارہ جب حضرت مخدومؒ پنجاب میں آئے اور لاہور میں قیام پذیر ہوئے تو اپنے پہلے تجربے کی روشنی میں اسے جنت مثال ہی پایا ہو۔

کشف الاسرار میں درج اشعار کو بھی حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب نے کتاب کے جعلی ہونے کے ثبوت میں پیش کیا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اشعار میں وہ شعریت نہیں جو نفحات الانس کے مصنف کے اشعار میں ملتی ہے۔ لیکن اگر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ حضرت مخدوم شعر کہا کرتے تھے تو ان اشعار کو محض سپاٹ ہونے کی بنا پر ان کے اشعار ماننے میں تامل اس وقت تک نامناسب ہے جب تک وہ مسروقہ دیوان یا ان کے بعض اشعار ان کی کسی اور تصنیف کے حوالہ سے مل کر اُن کے مزاج و معیار شعری کی تصدیق نہیں کرتے۔ قادر نامہ کو اسی قسم کے اختلاف کے باوجود غالب ہی کے کھاتے میں ڈالا جاتا ہے۔ جن لوگوں نے علامہ عنایت اللہ مشرقی کا تذکرہ پڑھا ہے وہ ان کے اشعار پڑھ کر ہنستے ہیں اسی طرح ابوالکلام آزاد کی نثر کے سامنے حسرت موہانی نے اپنی شاعری کو پھیکا پایا اور کہا کہ ؎

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

لیکن ان کے اشعار میں چونکہ وہ بات نہ تھی اس لیے خود مولانا نے بھی ان کو اپنے نام سے پیش کرنا مناسب نہ سمجھا اور وہ "یتیم اشعار" کے گروہ میں شامل ہو چکے ہیں۔ اسی قسم کے شعری حُسنِ ظن کی بناء پر ہی اکثر نقادوں کو اس میں شک ہے کہ "گنج بخش فیض عالم..."

والا شعر خواجہ معین الدین اجمیریؒ کا نہیں ہے اور شاید اسی احساس کے ماتحت دریابادی صاحب نے "تصوف اسلام" میں اسے بدل کر گنج بخش ہر دو عالم کر دیا بہر کیف دُوسروں سے اتفاق و اختلاف کا جو حق مصنّف کو حاصل تھا وہ دوسروں سے بھی چھینا نہیں جا سکتا اور قارئین ہی اندازہ لگا سکیں گے کہ نسیم صاحب گرہ کشائی میں اپنے ناخنوں کا استعمال کس کامیابی سے کر سکے ہیں۔

شریف کنجاہی

پنجاب یونیورسٹی

۹ محرم الحرام ۱۳۷۴ھ

اسم گرامی

سب قدیم و جدید تذکرے[1] اس پر اتفاق کرتے ہیں کہ حضرت مخدوم کا اپنا نام علی اور والد محترم کا نام عثمان تھا البتہ جدِ مکرم کا نام بعض نے علی اور بعض نے ابی علی لکھا ہے بلکہ اس پر بھی سب متفق ہیں کہ حضرت مخدوم کے والد اور جد امجد وقت کے نامور اہل اللہ میں سے تھے اور غزنی میں ان کے مزار مرجع خلائق ہیں۔ شہزادہ دارا شکوہ قادری نے لکھا ہے۔

خانوادۂ ایشاں خانوادۂ زہد و تقویٰ بودہ۔

یہی الفاظ جدید تذکرہ نگاروں نے دُہرائے ہیں۔

حضرت داتا گنج بخش کا خاندان علمی فضیلت اور باطنی فیوض کے باعث بڑی عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

---

[1] نفحات الانس جامی ص ۲۰۲، سفینۃ الاولیاء دارا شکوہ ص ۲۰۹، خزینۃ الاصفیا ج ۲ مفتی غلام سرور لاہوری ص ۲۳۲، نزہتہ الخواطر علامہ سید عبدالحی حسنی ج ۱ ص ۱۵۱، نکلسن انگریزی ترجمہ کشف المحجوب (دیباچہ)، ترجمہ کشف المحجوب (نسخہ سمرقند) مقدمہ حکیم محمد موسیٰ امرت سری ص ۸، مطبوعہ المعارف لاہور۔ گنج بخش بحیثیت عالم۔ ایم اے مجید یزدانی ص ۲۹، داتا گنج بخش (سوانحی خاکہ) محمد وارث کامل ص ۴، تذکرہ حضرت علی ہجویری حکیم سید امین الدین احمد ص ۱۰، حضرت داتا گنج بخش (انگریزی) پروفیسر مسعود الحسن

حکیم سید امین الدین احمد لکھتے ہیں :

تقوئی اور پرہیزگاری میں آپ کے آبا و اجداد ایک امتیازی شان اور شہرت رکھتے تھے۔

دارا شکوہ نے سفینۃ الاولیا میں آپ کے جدِّ امجد کے نام میں اختلاف کیا ہے اور حضرت مخدوم کو علی بن عثمان بن ابی علی لکھا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی کی تقلید میں خزینۃ الاصفیا میں غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں کہ :

نام پدر وی عثمان بن ابی علی۔

جبکہ مولانا عبدالرحمان جامی نفحات الانس میں اور علامہ سید عبدالحی حسنی نزہتہ الخواطر میں ابی علی نہیں علی لکھتے ہیں۔ حضرت مخدوم کے نسب ناموں میں بھی بیشتر سید علی بن عثمان بن سیّد علی مرقوم ہے۔

کشف المحجوب کا وہ نسخہ جسے حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے ہاتھ کا لکھا ہوا بتایا جاتا ہے اور جسے ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم کے کتاب خانہ سے لے کر شائع کیا گیا ہے قدیم ترین بتایا جاتا ہے اس میں خطبہ کتاب کے بعد حضرت مخدوم فرماتے ہیں :

قال علی بن عثمان بن ابی علی الجلابی الغزنوی ثم الہجویری رضی اللہ عنہ کہ طریق استخارات سپردم۔

روسی مستشرق فاضل ژدکوفسکی کے مرتب کردہ نسخہ کشف المحجوب میں بھی اس مقام پر علی بن عثمان بن ابی علی لکھا ہے۔ لیکن خود حضرت مخدوم دوسری جگہ لکھتے ہیں :

میں علی بیٹا عثمان کا اور عثمان بیٹا علی جلابی کا۔

نکلسن نے اپنے ترجمہ میں جو نسخہ اشاعت لاہور پر مبنی ہے ژدکوفسکی اور نسخہ مولوی محمد شفیع

مرحوم کے برعکس اس مقام پر ابی علی نہیں صرف علی لکھا اور ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ حضرت مخدوم کے جدِ مکرم کو علی یا ابی علی دونوں طرح لکھا اور پکارا جاتا تھا اور خود آپ نے اس سلسلہ میں کوئی اہتمام نہیں فرمایا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ابی کاتب سے سہواً لکھا گیا ہو اور پھر کسی نے قلمزد کرنے کی جرأت نہ کی ہو۔

وطن مالوف

بقیاس بعض حضرت مخدوم کے والد بزرگوار غزنی اُٹھ آئے تھے۔ حکیم سیّد ایمن الدین احمد لکھتے ہیں:

> شاہان غزنیہ کے زمانہ میں حضرت زید کے خاندان کے ایک بزرگ جن کا نام سید عثمان بن علی جلابی تھا۔ غزنی تشریف لائے اور وہیں سکونت اختیار کی۔ [1]

مگر یہ معلوم نہیں ہُوا کہ کب اور کن حالات میں حضرت مخدوم کے والد صاحب غزنی تشریف لائے تھے۔ صاحبِ مرکزِ تجلّیات کسی حوالے کے بغیر اس پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں:

> کہا جاتا ہے کہ جب آل سادات کے حالات بگڑ گئے اور ان کی مملکت میں افراتفری پیدا ہُوئی تو یہ خاندان بھی امن و امان کی تلاش میں نکلا اور بالآخر غزنی آ کر آباد ہو گیا۔ [2]

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شہر غزنی سے متعلق سرسری معلومات مہیا کر دی جائیں

---

[1] تذکرہ حضرت علی ہجویری ۱۸،۱۷

[2] مرکز تجلیات ص ۲۸ - ایم - ایس ناز

جہاں آپ کے والد محترم نے پناہ ڈھونڈی، جہاں آپ نے پرورش پائی اور جوان ہوئے جس سے حضرت مخدوم کے علمی اور روحانی فیضان کے پس منظر کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

مسلمان جغرافیہ دانوں کے مطابق غزنی اقلیم سوم (متعلق مریخ) میں واقع ہے۔

آل سبکتگین کے زمانہ میں شہر غزنی کو سیاسی اہمیت حاصل ہوئی اور سلطان محمود کے زمانہ میں تو خاص طور پر یہ شہر عروس البلاد اور مدینۃ الحکماء بن گیا۔

سلطان محمود نے نہ صرف فتح ممالک اور جمع اموال میں کمال حاصل کیا بلکہ علم و ادب کی بھی سرپرستی کی اور اپنے دربار میں زمانہ بھر کے منتخب شعراء اور علماء و فضلاء جمع کر دیئے۔[1]

علامہ سید عبدالحئی حسنی لکھتے ہیں:

علمائے ہند نے اس کی خاطر مختلف فنون میں کتابیں لکھیں وہ اس کی زیارت کے لیے دُور دُور سے آتے تھے۔ ان کی تعظیم کی جاتی تھی اور وہ ان کے ساتھ احسان کا ہاتھ بڑھاتا تھا۔[2]

اس طرح (رفتہ رفتہ) غزنی نے اسلامی ممالک میں مرکزی حیثیت حاصل کر لی۔

ہزاروں علماء و فضلاء اور اربابِ دانش سلطان محمود غزنوی کی زرپاشی اور معارف پروری سے بہرہ اندوز ہوتے تھے۔ شعر و سخن

---

[1] آبِ کوثر: شیخ محمد اکرام ص ۶۷

[2] نزہۃ الخواطر ج ۱ ص ۱۶۲

کی محفلیں رونق افروز ہوتی تھیں۔ یہ شہر علم و فن کے اعتبار سے اس قدر آباد ہو چکا تھا کہ یہاں چھوٹی چھوٹی بستیوں میں اساتذہ ہر وقت درس و تدریس میں مصروف رہتے تھے۔[1]

شہر غزنی کی اس حیثیت کے پیشِ نظر کوئی عجیب بات معلوم نہیں ہوتی کہ حضرت مخدوم کے والد محترم نے وہاں اقامت اختیار فرمائی۔

داراشکوہ نے غزنی کے ایک محلہ کا نام ہجویر اور دوسرے کا جلاب بتلایا ہے اور لکھا ہے کہ انھیں محلوں کی نسبت سے آپ کو ہجویری اور جلابی کہا جاتا ہے کہ "آپ ایک محلّے سے دُوسرے محلے میں منتقل ہو گئے"۔

بعد کے تذکروں میں کسی قدر اتار چڑھاؤ کے ساتھ اسی آواز کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اگر ڈاکٹر ظہور الدین احمد لکھتے ہیں:

وطن غزنی تھا۔ اکثر آپ کو جلابی لکھا ہے اور بعد میں ہجویری بھی کہا ہے جلاب اور ہجویر غزنی کے مضافات میں دو بستیاں تھیں اول جلاب ہی اصل وطن تھا بعد میں اُٹھ آئے ہوں گے۔[2]

تو اس شکیہ انداز کے مقابل حکیم سید امین الدین احمد زیادہ پُر اعتماد لہجہ میں لکھتے ہیں:

ہجویر اور جلاب نامی دو بستیاں مضافات غزنی میں ہیں آپ کی والدہ محترمہ ہجویر کی رہنے والی تھیں اور ہجویر ہی میں آپ پیدا ہوُئے اور آپ کے والد گرامی جلاب کے باشندے تھے۔ اسی وجہ سے

---

[1] مرکز تجلیات ص ۲۸

[2] پاکستان میں فارسی ادب ص ۱۱۹

آپ کو ہجویری اور جلابی کہا جاتا ہے۔[1]

اس ضمن میں کشف الاسرار کی شہادت بھی پیش کی جا سکتی ہے جس میں حضرت مخدوم، والد صاحب کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ آپ کے پیدا ہونے کی جگہ ہجویر ہے۔

سطور بالا کی روشنی میں بظاہر پروفیسر شیخ عبدالرشید کے محتاط انداز کی گنجائش کم نکلتی ہے کہ:

حضرت ابوالحسن علی بن عثمان ہجویری جلابی غزنوی غالباً غزنی میں پیدا ہوئے جہاں ان کا خاندان آباد ہوا تھا۔[2]

پروفیسر صاحب کے شک کی بنیاد (شاید) تذکرہ نگاروں کے وہ بیانات ہیں جن میں ہجویر اور جلاب کو غزنی کی نواحی بستیاں، قصبے یا گاؤں بھی لکھا گیا ہے اور محلے بھی ہجویر اور جلاب غزنی کی نواحی بستیاں بھی ہو سکتی ہیں اور محلے بھی۔ لیکن کسی نے اس ضمن میں اطمینان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ وہ بستیاں تھیں یا محلّے تھے اور آج ان کے نام وہی ہیں یا بدل گئے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہجویر اور جلاب بستیاں ہوں مگر ان کا تعلق غزنی سے نہ ہو۔

حضرت مخدوم کی سکونت کا مسئلہ دراصل الجھا ہوا ہے۔ عام طور پر نسبت قبیلہ وطن یا شہر سے ہوتی ہے۔ ہجویر اور جلاب غزنی سے الگ بستیاں بھی ہو سکتی ہیں اور محلے کی بھی گنجائش بہر حال موجود ہے کہ ہم فرنگ محل والوں کو لکھنوی نہیں لکھتے محلہ کے نام پر فرنگ محلی کہتے ہیں۔ ایم۔ اے مجید یزدانی اس ضمن میں ایک اور مشکل کی طرف اشارہ

---

[1] تذکرہ حضرت علی ہجویری

[2] حیات و تعلیمات حضرت داتا گنج بخش

کرتے ہیں:

حضرت مخدوم نے الجلابی ثم الہجویری لکھا ہے۔ ثم کا لفظ اس
ترک سکونت کے سلسلے میں استعمال ہوتا ہے جو مستقل حیثیت سے
کی جائے[1]

تو کیا ایک محلہ سے دوسرے محلہ میں سکونت اختیار کرنے کے لیے ثم کا لفظ استعمال ہوگا۔
الجھاؤ اور بڑھتا ہے کہ حضرت مخدوم اکثر وبیشتر کشف المحجوب میں جلابی لکھتے ہیں۔

من بعدهٔ قال الشیخ ابو الحسن بن عثمان بن ابی علی الجلابی۔

وقال المسئول وھو علی بن عثمان الجلابی۔

لیکن تذکرہ نگار حضرت مخدوم کو ہجویری بھی لکھتے ہیں۔ سفینۃ الاولیاء میں حضرت مخدوم کے تذکرے کا عنوان ہے:

حضرت شیخ پیر علی ہجویری قدس سرہٗ۔

نزہت الخواطر میں علامہ سید عبدالحی حسنی بھی تذکرہ حضرت مخدوم کا عنوان کرتے ہیں،

حضرت علی ہجویری۔

قدیم اور جدید تذکروں کا یہی انداز ہے جلابی اور ہجویری کے مقابل مستشرقین مسلسل حضرت مخدوم کو غزنوی لکھتے ہیں ژدکوفسکی نے لکھا ہے:

الشیخ العالم الزاھد شیخ الشیوخ قدوۃ اھل طریقت
کاشف الاسرار الحقیقت ابو الحسن علی بن عثمان الغزنوی۔

جلاب سے آپ کی نسبت والد محترم حضرت عثمان بن ابی علی جلابی کی وجہ سے قائم ہوئی۔

---

[1] داتا گنج بخش بحیثیت عالم

ہجویر سے تذکرہ نگاروں کو آپ کی نسبت قائم کرنے کا جواز کشف المحجوب سے ملا۔ جلاب وہجویر نواحی بستیاں ہوں یا غزنی کے محلّے یا غزنی سے جُدا الگ الگ دو گاؤں یا قصبے غزنی، جلاب اور ہجویر تینوں جگہوں سے یہ سعادت چھینی نہیں جا سکتی کہ حضرت مخدوم کا تعلق ان سے تھا۔ ژدکوفسکی نے درست لکھا ہے:

الجلابی، الہجویری، الغزنوی۔

حضرت مخدوم لاہور تشریف لائے اور بالآخر وہیں آسودۂ خاک ہوئے لاہور کو بھی آپ کی نسبت سے شرف ملا۔ علامہ سید عبدالحی حسنی نے حضرت مخدوم کے تذکرہ کا عنوان کیا ہے:

علی بن عثمان بن علی الجلابی، ہجویری، غزنوی، لاہوری[1]

یہی عنوان خزینۃ الاصفیا میں غلام سرور لاہوری نے قائم کیا ہے:[2]

شیخ علی مخدوم الجلابی الہجویری الغزنوی اللّاہوری قدس سرہٗ۔

---

[1] نزہت الخواطر ج ۱ ص ۱۵۱

[2] خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص ۲۳۲

ولادت[1]

حضرت مخدوم کا سنِ پیدائش کسی قدیم کتاب میں درج نہیں، اس دور کے محققین نے ظن و تخمین سے کام لیا ہے۔ پروفیسر نکلسن کا خیال ہے:

"اُن کی پیدائش دسویں صدی کے آخری عشرہ یا گیارھویں صدی کے پہلے عشرہ میں ہُوئی ہوگی۔"[2] یعنی ۳۸۱ھ تا ۴۰۱ھ

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع لکھتے ہیں:

"اندازے سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی ولادت پانچویں صدی کے شروع میں ہُوئی ہوگی۔"[3]

ڈاکٹر معین الحق کی رائے یہ ہے:

بعض لوگوں نے ان کی پیدائش کا سال ۴۰۰ھ لکھا ہے لیکن اس کو یقینی نہیں کہا جا سکتا۔"[4]

---

(۱) کشف المحجوب (نسخہ سمرقند) اردو ترجمہ، مقدمہ حکیم محمد موسیٰ امرت سری ص ۱۰، مطبوعہ المعارف۔ لاہور

(۲) کشف المحجوب انگریزی ترجمہ نکلسن، مقدمہ، ص ۱۱

(۳) مقالات دینی و علمی ص ۲۲۳

(۴) معاشرتی و علمی تاریخ، طبع کراچی ص ۲۱

منشی محمد دین فوق رقم فرماتے ہیں:

ان کی پیدائش کا فخر ۴۰۰ھ یا ۴۰۱ھ کو حاصل ہوتا ہے۔[1]

سالِ ولادت کے باب میں مذکورۃ الصدر قیاس آرائیوں کی تائید رسالہ ابدالیہ سے بھی ہوتی ہے۔ رسالہ مذکور کے مؤلف نے لکھا ہے کہ حضرت علی ہجویری وقتاً فوقتاً محمود غزنوی کے دربار میں جاتے تھے اور انہوں نے عنفوان شباب میں ایک ہندی فلسفی سے مناظرہ بھی کیا تھا۔[2] عنفوان شباب سے بیس اکیس سال عمر فرض کر سکتے ہیں۔ محمود غزنوی ۴۲۱ھ میں فوت ہُوا تھا لہٰذا رسالہ ابدالیہ کی اس روایت کی بنا پر حضرت کا سالِ ولادت ۴۰۰ھ کے لگ بھگ قرار دیا جا سکتا ہے۔

---

[1] داتا گنج بخش ص ۵

[2] فہرست مخطوطات فارسیہ انڈیا آفس لائبریری نمبر ۴ ، ۱۷۷ بحوالہ کشف المحجوب مقدمہ حکیم محمد موسیٰ، مطبوعہ المعارف، لاہور

کنیت

حضرت مخدوم کی کنیت ابوالحسن ہے۔ کشف المحجوب کے ابتدا میں اسم گرامی معہ کنیت یُوں درج ہے:

ابوالحسن علی بن عثمان بن ابی علی

نفحات الانس میں مولانا عبدالرحمان جامی لکھتے ہیں:

وکنیت وے ابوالحسن است۔[1]

سفینۃ الاولیا میں شہزادہ داراشکوہ، خزینۃ الاصفیا میں مفتی غلام سرور لاہوری کے علاوہ جدید تذکرہ نگار بھی تائید کرتے ہیں کہ حضرت مخدوم کی کنیت ابوالحسن ہے۔

ابوالحسن کنیت کسی فرزند گرامی کی نسبت سے مل سکتی تھی مگر کسی تذکرہ سے معلوم نہیں ہوا ہے کہ حسن نامی آپ کی اولاد سے تھے۔ حضرت مخدوم کے فرزند ذاتی صفات کی بنا پر نہ سہی حضرت کے فرزند ہونے کے سبب احترام کے لائق ہوتے اور تذکرہ نگار ان کا ذکر بھی ضرور کرتے۔ روایت کے مطابق رائے راجو آپ کے دستِ حق پرست پر اسلام لایا۔ یہی رائے راجو آپ کے خلیفہ ہوئے۔ رائے راجو کی اولاد دربار کی خدام اور مجاور رہی ہے۔ ظاہر ہے مرشد زادے کی موجودگی میں ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔

---

[1] نفحات الانس ص ۲۰۲

ایک قیاس اس ضمن میں یہ ہے کہ حضرت مخدوم کا اسم گرامی علی ہے اور آپ صحیح النسب حسنی سید ہیں اور امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے نسبت کے سبب آپ کی کنیت بھی ابوالحسن ہے اور ممکن ہے کہ والدِ محترم نے آپ کا نام صرف علی نہیں ابوالحسن علی رکھا ہو۔

ایک اور نکتہ بھی غور طلب ہے حضرت مخدوم مرید حضرت محمد بن حسن ختلی ہیں جنھیں بعض تذکرہ نگار ابوالفضل، بعض ابوالحسن محمد بن حسن الختلی لکھتے ہیں اور آپ مرید ابوالحسن حصری کے ہیں۔ شاید حضرت مخدوم نے اسی نسبت دوگانہ کے باعث کنیت ابوالحسن پسند فرمائی۔

لقب

حضرت مخدوم کا لقب گنج بخش ہے۔ مشہور ہے کہ یہ لقب آپ کو حضرت خواجہ معین الدین اجمیری نے دیا۔ خزینۃ الاصفیا کے حوالے سے مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

حضرت خواجہ معین الدین حسن سجزی اجمیری نے آپ کے مزار پر چلّہ کیا اور اکتسابِ فیض اور برکات کے بعد رخصت ہونے لگے تو مزار کے رُخ کھڑے ہو کر یہ شعر پڑھا:

گنج بخشِ ہر دو عالم مظہرِ نورِ خدا
کاملاں را پیرِ کامل ناقصاں را رہنما

اس وقت سے گنج بخش کا لفظ عام زبانوں پر چڑھ گیا۔[1]

حضرت عبدالماجد دریابادی نے شعر میں جو حضرت مخدوم کی لوحِ مزار پر کندہ ہے اور زبان زد خاص و عام ہے کچھ تبدیلیاں کر دی ہیں۔ شعر یُوں ہے:

گنج بخش فیض عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را رہنما

اکثر تذکرہ نگار تاہم اس امر پر اتفاق کرتے ہیں کہ گنج بخش کے لقب سے آپ کو حیات

---

[1] تصوفِ اسلام ص ۳۶

مبارک میں پکارا جاتا تھا۔ پروفیسر شیخ عبدالرشید کشف الاسرار کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ حضرت مخدوم نے شکایت فرمائی ہے کہ لوگ آپ کو گنج بخش کہتے ہیں حالانکہ میں ایک دانہ پر قادر نہیں اور دل سے کہا کہ اس لقب پر مغرور نہ ہوجانا گنج بخش صرف خدائے تعالیٰ کی قادر و توانا ذات ہے۔

> اس کے معنی یہ ہوئے کہ یہی قیاس معقول ہے کہ وہ اپنی زندگی میں بھی گنج بخش کہلاتے تھے[1]

جناب ایم۔ اے مجید یزدانی اس خیال کو مضحکہ خیز بتلاتے ہیں کہ حضرت مخدوم اس شعر کی وجہ سے گنج بخش مشہور ہوئے۔ اس صورت میں (وہ کہتے ہیں) پہلا مصرع بے معنی ہوگا۔

> اگر گنج بخش کو لقب قرار نہ دیا جائے تو پورے شعر کا ترجمہ یوں ہوگا:
> خزانہ بخشنے والا، دنیا کو فیض پہنچانے والا، خدا کے نور کا مظہر، ناقصوں کا پیر کامل، کاملوں کی رہنمائی کرنے والا۔
>
> یہ صفات کس موصوف سے متعلق ہیں ظاہر ہے کہ اس میں پہلی دو لفظی تراکیب (گنج بخش) لقب کے طور پر استعمال ہوئی ہیں۔ اس صورت میں شعر بامعنی ہوجاتا ہے۔

> حضرت مخدوم سخاوت میں مشہور تھے فقراء کی حاجت روائی میں آپ مقروض بھی ہوگئے تھے۔ ایک مبلغ اور عالم کی حیثیت سے وہ علم و فضل کے خزانے لٹاتے رہے تھے اور ظاہر بین توہم پرستوں کے

---

[1] حیات و تعلیمات حضرت داتا گنج بخش ص ۲۸

نزدیک کشف و کرامت کے گنج گراں مایہ کی بھی ان کے ہاں کمی نہ تھی
تو پھر ان کا گنج بخش کے لقب سے مشہور ہو جانا کون سی بڑی بات ہے[۱]

بعض اصحاب اس شعر کو حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کا شعر ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اس شعر کا حضرت مخدوم کے لوحِ مزار پر لکھا جانا اور شاعر کا نام دریافت نہ ہونا بذاتِ خود عجیب بات ہو گی۔ حرج نہیں ہے اگر اس شعر کو حضرت معین الدین چشتی سے متعلق رکھیں تا ایں کہ کسی قدیم بیاض کے حوالے سے اس ضمن میں کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو جائے۔

عجیب بات تو یہ ہے کہ نفحات الانس میں جامی اور سفینۃ الاولیا میں شہزادہ دارا شکوہ کو حضرت مخدوم کا لقب گنج بخش معلوم نہیں تھا۔

بہر حال حضرت مخدوم کے حوالے سے گنج بخش کا لقب ایسا مقبول ہوا کہ دیگر اکابر صوفیہ کو بھی گنج بخش کہا گیا ہے۔ جناب پروفیسر شیخ عبدالرشید ایک دو حاکموں کے نام بتلاتے ہیں۔ جو اس لقب سے مشہور ہوئے اولیاء اللہ میں سلطان سخی سرور کو لکھ داتا شیخ حامد قادری کو گنج بخش کہتے ہیں۔ جو نام پروفیسر صاحب نے گنوائے ہیں ان کے علاوہ ساہن پال کے حضرت نوشہ کو گنج بخش کہتے ہیں۔ گجرات کے شاہ ولایت شاہ دولہ دریائی کا لقب بھی گنج بخش ہے۔ شیخ بہاء الدین کے خلیفہ امیر کبیر ہمدانی بھی گنج بخش کہلاتے ہیں یہ نتیجہ نکالنا غلط نہیں ہے، کہ گنج بخش ایسا لقب ہے، جو بلا تخصیص غیر معمولی اثر و نفوذ کی شخصیت کو دے دیا جاتا تھا۔

حضرت مخدوم کو داتا صاحب بھی کہتے ہیں۔ جناب ایم۔ اے مجید یزدانی پادری جان اے سبحان کے حوالے سے لکھتے ہیں:

---

[۱] گنج بخش بحیثیت عالم ص ۳۴

1021

لفظ داتا ہندی گنج بخش کے مترادف ہے اس لیے پنجاب میں انہیں
داتا صاحب کہا جاتا ہے۔[1]

جان اے سبحان کے اس اقتباس پر جناب ایم۔ اے مجید یزدانی کو صرف یہ اعتراض ہے کہ پنجاب میں ہندی نہیں بولی جاتی ہے ویسے انہیں اقرار ہے کہ حضرت مخدوم کو داتا صاحب کہتے ہیں۔ غلط فہمی یہ ہوئی ہے کہ انہوں نے داتا کو ہندی لفظ مان لیا حالانکہ یہ اسی قدر پنجابی لفظ بھی ہے اور پنجاب میں ہر کہیں بولا سمجھا جاتا ہے بلکہ پنجابی کا ایک دور وہ بھی تھا جب اسے ہندی یا ہندوی کہتے تھے۔

---

[1] گنج بخش بحیثیت عالم بحوالہ تصوف، صوفیا اور مقبرے پادری جان اے سبحان

شجرہ نسب

حضرت مخدوم کا شجرہ نسب ڈاکٹر ظہور الدین احمد کی کتاب "پاکستان میں فارسی ادب" میں یوں درج ہے :

علی بن عثمان بن ابی علی بن عبدالرحمٰن بن سید ابوالحسن علی بن سیّد حسن اصغر بن حضرت زید بن امام حسن بن علی (علیہ السلام)

میاں طفیل محمد کے دیباچہ ترجمہ اردو کشف المحجوب میں شجرہ نسب حسب ذیل ہے :

علیؒ[1] بن عثمانؒ[2] بن علیؒ[3] بن عبدالرحمانؒ[4] بن شاہ شجاعؒ[5] بن سید ابوالحسنؒ[6] علی بن سید حسنؒ اصغر بن سید زید شہید بن امام حسنؑ[9] ابن علیؑ[10] ابن ابی طالبؑ[11] (علیہ السلام)

اس شجرہ نسب میں حضرت مخدوم کے جدّ مکرم (۳) کا نام علی ہے ابی علی نہیں لکھا گیا ہے اور حضرت زید کو سید زید شہید (۷)

داتا گنج بخش کے سوانحی خاکہ میں محمد وارث کامل نے حضرت مخدوم کا شجرہ نسب ذرا مختلف دیا ہے :

علیؒ[1] بن سیّد عثمانؒ[2] بن سید علیؒ[3] بن عبدالرحمٰنؒ[4] بن سیّد عبداللہؒ[5] بن سید ابوالحسنؒ[6] علی بن سید حسنؒ بن حضرت زیدؒ شہید بن حضرت امام حسنؑ[9] بن

حضرت علیٰ المرتضیٰ (رضؓ)

حضرت مخدوم کے جدِ مکرم کا نام علی (۳) دیا گیا ہے ابو علی نہیں۔ شجرہ کی کڑیوں میں نئے نام کا اضافہ سید عبداللہ بن عبدالحسن علی بن سید حسن (۵) ہے جبکہ سید حسن (۷) کو حسن اصغر نہیں لکھا گیا ہے۔ محمد وارث کامل صاحب نے بھی حضرت زید کو زید شہید (۸) بن حضرت امام حسن علیہ السلام کہا ہے۔

جناب ایم۔ اے مجید گنج بخش بحیثیت عالم کتاب میں مندرجہ ذیل شجرہ دیتے ہیں:

علی بن عثمان بن علی بن سید عبدالرحمان بن عبداللہ بن ابی الحسن بن حسین بن زید بن حسن بن حضرت علیؓ

یعنی جدِ مکرم کا نام علی دیا ہے ابی علی نہیں۔ عبداللہ بن ابی الحسن (۵) کا نام شجرہ کی کڑیوں میں موجود ہے سید ابی الحسن کو ابی الحسن علی نہیں لکھا گیا ہے (۶) ابی الحسن بن حسین بن زید (۷) نیا نام ہے۔ حسن اصغر بن زید کا نام موجود نہیں۔ زید بن امام حسن (۸) کو زید شہید نہیں لکھا ہے۔

جناب بشیر الدین سعدی کتاب دس ولی میں حضرت مخدوم کا مندرجہ ذیل شجرہ نسب تحریر فرماتے ہیں:

علیٰ بن عثمان[2] بن علی[3] بن عبدالرحمان[4] بن عبداللہ[5] بن ابی الحسن[6] بن حسن[7] بن زید[8] شہید بن جناب امام[9] شہید حسن بن علی[10] کرم اللہ وجہہ۔

حضرت مخدوم کے جدِ مکرم کا نام اس شجرہ نسب میں بھی علی (۳) دیا ہے۔ عبداللہ بن ابی الحسن (۵) کی کڑی موجود ہے ابو الحسن بن حسن (۶) ابو الحسن علی نہیں لکھا گیا نہ حسن (۷) کو حسن اصغر۔ حضرت زید کو زید شہید (۸) لکھا ہے۔ امام حسن علیہ السلام کو بھی

شہید کہا ہے ۔

مرکز تجلیات نامی کتابچہ میں شجرہ نسب دیکھئے :

علی[۱] ہجویری بن عثمان[۲] بن سید علی[۳] بن عبدالرحمان[۴] بن شاہ شجاع[۵] بن ابوالحسن[۶] بن حسین[۷] اصغر بن سیّد زید[۸] بن حسن[۹] بن حضرت علی[۱۰] ابن ابی طالب بن عبدالمطلب بن ہاشم ۔

جدمکرم کا نام دوسرے شجروں کی طرح علی (۳) دیا گیا ہے ۔ نیا نام شاہ شجاع ہے جسے نمبر ۵ پر لایا گیا ہے اور سید عبداللہ بن ابوالحسن (۶) اور ابن حسین اصغر بجائے حسن اصغر لکھا ہے ۔ حضرت زید کو شہید نہیں کہا ہے ۔ مفتی غلام سرور لاہوری خزینۃ الاصفیا میں رقم طراز ہیں :

شجرہ نسب حضرت ممدوح بدیں نوع درج تواریخ متقدمین است کہ حضرت مخدوم بن عثمان بن سید علی بن سید عبدالرحمان بن شاہ شجاع بن ابوالحسن علی بن حسین اصغر بن سید زید شہید بن حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ ۔ (ج ۲ ص ۲۳۲)

مندرجہ بالا اقتباس میں بھی جد مکرم کا نام علی ہے اور سید عبداللہ کے نام کی بجائے شجرہ کی کڑیوں میں شاہ شجاع بن ابوالحسن علی بن حسین اصغر لکھا ہے حسن اصغر نہیں ۔ حضرت زید بن حسن کو زید شہید لکھا گیا ہے ۔

حضرت عبدالماجد دریا بادی کتاب 'تصوفِ اسلام' میں جو شجرہ نسب بیان فرماتے ہیں درج ذیل ہے :

علی[۱] بن سید عثمان[۲] بن سید علی[۳] بن عبدالرحمان[۴] بن شاہ شجاع[۵] بن ابوالحسن[۶] علی

بن حسن اصغر بن سید زید شہید بن امام[9] حسن بن علی[10] المرتضیٰ[11]۔

اس شجرہ نسب میں بھی شاہ شجاع بن ابوالحسن علی (۵) دیا گیا ہے، سید عبداللہ بن ابوالحسن علی نہیں۔ حضرت زید کو زید شہید (۸) لکھا گیا ہے۔ پیر غلام دستگیر نامی کتاب بزرگانِ لاہور میں شجرہ نسب لکھتے ہیں:

حضرت مخدوم[1] علی بن سید عثمان[2] بن سید علی[3] بن سید عبدالرحمان[4] بن سید عبداللہ[5] (شجاع شاہ) بن سید الحسن[6] علی بن حسن بن سید زید بن امام[9] حسن رضی اللہ عنہ۔

حضرت پیر غلام دستگیر نامی شاہ شجاع اور سید عبداللہ بن سید ابوالحسن علی کا معمہ حل کرتے ہیں۔ یہ دونوں متبادل نام ہیں۔ آپ سید عبداللہ (۵) لکھ کر قوسین میں شاہ شجاع نہیں، شجاع شاہ لکھتے ہیں۔ نمبر ۸ پر زید شہید بن حضرت امام حسن علیہ السلام نہیں بلکہ تصریح فرمائی ہے کہ زید شہید نہیں لکھنا چاہیئے۔

مفتی غلام سرور نے زید کے ساتھ جو لفظ شہید لکھا ہے وہ ٹھیک نہیں کیونکہ جو زید شہید مشہور ہیں وہ امام زین العابدین بن امام حسین بن علی[4] کے فرزند ہیں جنھوں نے مروانی خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے خلاف ۱۲۲ھ میں خروج کیا۔[1]

تاریخی واقعات سے اس کی تائید ہوتی ہے ترجمہ اردو صحیفہ کاملہ کے پیش لفظ میں جناب سید مرتضیٰ حسین، امام زین العابدین علی بن حسین شہید کربلا علیہ السلام کے تعارف سن ولادت و وفات اور مقام دفن کے بعد اولاد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] بزرگانِ لاہور ص ۱۸۴

اولاد : امام محمد باقر علیہ السلام جناب زید شہید ، نو صاحبزادے ، چار بیٹیاں [1]

فاضل مترجم سید مرتضیٰ حسین صحیفہ کاملہ تاریخ کی روشنی میں دکھلاتے ہوئے لکھتے ہیں :

اس کتاب کے بارے میں یہ مسلّم ہے کہ امام زین العابدین علیہ السلام کی لکھوائی ہوئی ہے ۔ اس کا ایک نسخہ جناب زید اور دوسرا نسخہ جناب امام محمد باقر علیہ السلام نے لکھا تھا ۔ امام محمد باقر کا مخطوطہ امام جعفر صادق علیہ السلام کے پاس تھا اور جناب زید کا قلمی جناب یحیٰی کے پاس تھا ۔

حضرت زید شہید کے فرزند گرامی کا نام یحیٰی تھا جو زید شہید کے بعد سولی دیئے گئے تھے ۔

متوکل بن ثقفی کہتے ہیں کہ جناب زید کی شہادت ہو چکی تھی اور یحیٰی خراسان جا رہے تھے راستے میں میں حاضر ہوا جناب یحیٰی نے فرمایا کہ متوکل کہاں سے آ رہے ہو ؟ میں نے عرض کی حج سے ۔ آپ نے مدینہ کے اپنے اعزّہ خصوصاً امام جعفر صادق کی خیریت دریافت فرمائی متوکل نے تمام حضرات کے غم و اندوہ کو بیان کیا جو شہادت حضرت زید سے اہل بیت پر نازل ہوئے ــــــ فرمایا ہاں میرے چچا نے والد کو منع کیا تھا ۔ [2]

---

[1] صحیفہ کاملہ ص ۹ [2] ایضاً ص ۳۰

اقتباس مندرجہ بالا سے واضح ہے کہ یحییٰ بن زید شہید بن علی (امام زین العابدین)، حسین شہید کربلا ابن علی علیہ السلام ہیں۔ حضرت مخدوم حسنی سید ہیں۔ ان کے شجرہ نسب میں جناب زید شہید شامل نہیں کیے جا سکتے۔ نساب کا انداز یہ ہے کہ خاندانی نسبت کو بڑی شخصیت سے متعلق کرتے ہیں سبھوں نے حضرت مخدوم کو امام حسن علیہ السلام سے نسبت کی وجہ سے حسنی لکھا ہے۔ امام حسن علیہ السلام کا مرتبہ حضرت زید سے کہیں بلند تر ہے لیکن حضرت زید کو شہادت کی دولت میسر آئی۔ حضرت مخدوم کے نسب نامہ میں زید شہید شامل ہوتے تو آپ کو سید حسنی کی بجائے زیدیہ سادات سے متعلق کیا جاتا ——— فرزند امام حسن علیہ السلام سے کہیں زیادہ حضرت زید شہید بن علی بن حسین شہید کربلا نے نام پایا اس لیے انساب میں جہاں حضرت مخدوم کے شجرہ میں زید کا نام ملا بآسانی زید شہید لکھ دیا گیا۔ ایسا ہی معاملہ شاہ شجاع اور شجاع شاہ کا ہے۔ شاہ شجاع کرمانی مشہور ہیں۔ ممکن ہے عبداللہ بن ابوالحسن علی بن حسن بن زید کو عبادت و ریاضت میں ان کی حوصلہ مندی کے سبب شجاع شاہ کہا گیا اور تذکرہ نویسوں نے بآسانی شجاع شاہ کو شاہ شجاع (کرمانی) لکھ دیا ہو۔

حضرت مخدوم کے شجرہ کا اب کتاب انساب کی روشنی میں مطالعہ کرنا چاہئے۔

محمد اکبر خان شیرازی کتاب انساب موسومہ بہ مجموعہ اکبری میں لکھتے ہیں:

> بشواہدات کتب معتبرہ مثل مدارج النبوت و معارج النبوت و بحر الانساب و بحر التناسل و شرف النبوت وغیرہ ذلک آنکہ بہ صحت رسیدہ جمع نمودہ۔ (ورق ۲ الف)

مجموعہ اکبری کے مطابق فرزندان حضرت امام حسن علیہ السلام ہیں، قاسم، عبداللہ (شہیدانِ

کربلا) ابراہیم، عمران، اسحاق، عبدالرحمان، علی، زید، حسن مثنیٰ، صالح، زبیر، یحیٰ، یوسف، عون شامل ہیں۔

حضرت زید کی اولاد میں صرف ایک فرزند تھے ——— حسن ——— حضرت حسن کے نو (۹) بیٹے ہوئے۔ تفصیل یہ ہے اسحاق، عبداللہ ابوزید، ابوالقاسم، علی اصغر، ابراہیم، طاہر، محمد، اسماعیل علی کے فرزند گرامی کا نام عبدالرحمان تھا۔ جن کے چار بیٹے ہوئے، جن کے نام ابوالحسن، سیّد وہیم، عبدالشکور اور علی ہیں۔ علی سے متعلق صاحبِ مجموعہ اکبری لکھتے ہیں:

> وعلی سجزی اولاد او در اصفہان است واو دو فرزند داشت ابی الحسین و سیّد محمد۔ (ورق)

معمولی اختلاف کے باوجود حضرت مخدوم کے شجرہ نسب کی تصدیق مجموعہ اکبری سے ہو جاتی ہے۔

تحصیلِ علم

حضرت مخدوم نے ابتدائی تعلیم غزنی میں بزرگوں کے سایہ میں حاصل کی ہوگی جیسا کہ عام طور پر دستور تھا۔

آپ سوا چار برس کے لگ بھگ ہوئے تو آپ کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس زمانہ میں رسمی تعلیم رائج تھی وہ آپ نے اپنے خاندان کے بزرگوں اور غزنی کے مختلف مدارس سے حاصل کی۔

محمد وارث کامل بھی لکھتے ہیں کہ:

داتا گنج بخش خاندان سادات کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کی تعلیم و تربیت میں خاندانی روایات کی بنا پر آپ کے والد محترم نے کافی سے زیادہ دلچسپی لی۔

یہ سب اندازے ہیں جو درست بھی ہو سکتے ہیں۔ مکتبوں میں اس وقت عربی و فارسی زبان دانی کی تعلیم کے علاوہ قرآن و تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، فلسفہ ادب پڑھائے جاتے تھے۔ کشف المحجوب کے اعلیٰ علمی مقام میں ابتدائی درسی تعلیم کا بڑا حصہ مانا جا سکتا ہے مگر مجتہدانہ شان عالم اسلام کے عظیم استادوں کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کے بعد ہی مل سکتی تھی۔ خاندانی روایات کے پیش نظر حضرت مخدوم کا شوق عبادت بھی

درست مانا جا سکتا ہے جس کی تائید کشف المحجوب سے ہوتی ہے لیکن جیسا کہ دریابادی صاحب فرماتے ہیں:

استعداد علمی کی تفصیل کسی تذکرہ میں نظر سے نہیں گزری لیکن کشف المحجوب خود اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ اس کا مصنف علم باطن کے علاوہ علوم ظاہری پر بھی وسیع نظر رکھتا ہے۔

سلسلہ بیعت

حضرت مخدوم کا سلسلۂ بیعت جنیدی ہے۔ مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں:

وسلسلۂ عالیہ وے بہ سہ واسطہ بہ شیخ شبلی بدیں طریق می رسد کہ شیخ ابوالفضل بن حسن پیر روشن ضمیر وے مرید شیخ حصری و وے مرید شیخ ابوبکر شبلی است۔

حضرت مخدوم لکھتے ہیں:

ہمارے تمام شیوخ واکابرین سلسلۂ جنیدی سے منسلک ہیں اور یہ طریقہ بہت مشہور و معروف ہے۔

حضرت جنید بغدادی کے واسطے سے آپ کا رشتۂ طریقت حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام اور حضور سرکار رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے استوار ہوتا ہے۔ شجرۂ طریقت حسب ذیل ہے[1]:

حضرت مخدوم ہجویری علی بن عثمان مرید ابوالفضل ختلی مرید ابوالحسن حصری مرید ابوبکر شبلی مرید حضرت جنید بغدادی مرید خواجہ سرّی سقطی

---

[1] کشف المحجوب (نسخہ سمرقند) اردو ترجمہ مقدمہ حکیم محمد موسیٰ امرت سری ص ۱۳

مرید حضرت معروف کرخی مرید حضرت داؤد طائی مرید حضرت حبیب عجمی
مرید حسن بصری مرید حضرت علی المرتضیٰ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم)

حضرت داتا گنج بخشؒ سلسلہ جنیدیہ میں حضرت حسن خُتّلی م ۴۶۰ھ سے بیعت تھے،
اپنے پیر و مرشد کے علوِ مقام کے بارے میں کشف المحجوب میں لکھتے ہیں:

صوفیہ متاخرین میں سے اوتاد کی زینت اور عابدوں کے شیخ ابوالفضل
محمد بن الحسن الختلی ہیں، طریقت میں میری بیعت اُن ہی سے ہوئی
علم تفسیر اور روایات (حدیث) کے عالم تھے اور تصوف میں حضرت
جنید کا مذہب رکھتے تھے۔ حضرت حُصری کے راز دار مُرید تھے ابو عمر
قزوینی اور ابوالحسن سالبہ کے ہمعصر تھے۔ صحیح گوشہ نشینی کے لیے
ساٹھ سال تک تنہائی کی تلاش میں پھرتے رہے اور مخلوق کے
ذہنوں سے اپنا نام محو کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے، زیادہ تر
جبل لُکام میں قیام پذیر رہے اور طویل عمر پائی۔[۱]

حضرت جنید بغدادی تک روحانی فیضان کو قطعی سمجھتے ہوئے ہم تاریخ و تذکرہ
سے الُختلی، الحصری، شبلی اور حضرت جنید کا ذکر کرتے ہیں تاکہ حضرت مخدوم کا روحانی
پس منظر سامنے رہے۔

حضرت شیخ ابوالفضل محمد بن حسن ختلی شیخ ابوالحسن حصری کے مرید تھے۔ صاحب
خزینۃ الاصفیا لکھتے ہیں:

نام وے علی بن ابراہیم حصری است بہ بغداد ساکن شدد

۱؎ کشف المحجوب نسخہ سمرقند اردو ترجمہ مقدمہ حکیم محمد موسیٰ امرت سری ص ۱۳

خرقۂ فقر از دست شیخ ابوبکر شبلی داشت از پیروان ، مذہب امام حنبل بود در سخن گفتن وافشائے راز توحید مثلش کسے بلند سخن نہ بود۔[1]

آپ نے ۳۷۱ھ میں انتقال فرمایا ؎

عابد مرحوم ترحیلش بگو
نیز ابراہیم ہادی امام[2]

حضرت مخدوم ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

آپ قوم کے بزرگ اور طریقت کے سردار ہوئے ہیں۔ ابتداء میں خلیفہ کے درباریوں کے افسر اعلیٰ تھے اور حضرت جنید کے ارادت مندوں میں شامل تھے آپ نے توبہ خیر النساج کی محفل میں کی۔[3]

ابوالحسن خیر النساج ، ابوحمزہ بغدادی ، ابوالحسن النوری کے ہم نشینوں میں تھے۔ الخواص اور شبلی نے آپ کے ہاتھ پر توبہ فرمائی۔

الطبقات الکبریٰ میں علامہ شعرانی لکھتے ہیں۔ ان کی قبر پر جعفر بن یونس لکھا ہے۔ یہ اصل خراسان کے تھے مگر بغداد میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے وہیں نشوونما پائی اور خیر النساج کی محفل میں توبہ کی۔ ابوالقاسم جنید اور ان کے ہم عصر بزرگوں کی صحبت میں رہے اور علم وحال وظرف میں اپنے وقت کے یکتا ہوئے انہوں نے امام مالک کے مذہب

---

[1] ج ۳ ص ۲۰۶

[2] ج ۳ ص ۲۰۶

[3] اردو ترجمہ کشف المحجوب میاں طفیل محمد ص ۲۲۷

میں تفقہ حاصل کیا اور بہت حدیثیں لکھیں۔ستاسیؔ سال دنیا میں رہے[1]۔

سفینۃ الاولیا میں شہزادہ داراشکوہ کے تذکرہ سے وضاحت طلب مقامات صاف ہو جاتے ہیں:

آپ کی کنیت ابوبکر اور نام جعفر بن یونس اور دوسری روایت میں دلف بن مجدر ہے۔آپ حضرت جنید بغدادی کے خاص مرید تھے۔ آپ کو خرقہ بھی اسی بارگاہ سے ملا، چنانچہ شیخ فرماتے ہیں کہ ہر قوم میں ایک تاج ہوتا ہے اور اس قوم کا تاج شبلی ہے آپ مذہب مالکی کے پیرو تھے۔ایک قول کے مطابق آپ کا خاندان خراسان کے موضع شبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔طبقات سلمی میں ہے کہ آپ خراسانی اصل کے اعتبار سے ہیں۔جائے ولادت بغداد شریف ہے۔ایک روایت کے مطابق آپ کی جائے ولادت سامرہ ہے اور آپ کی اصل شروشنبہ ہے جو فرغانہ کے مضافات میں ہے۔آپ ابتدا میں پوشیدہ طور پر خلیفہ تھے۔آپ کی وفات جمعہ کی شب ۲۷ ذی الحجہ ۳۳۴ھ کو ہوئی۔آپ کی عمر ۸۷ سال تھی۔مزار مبارک بغداد میں ہے۔اس کی لوح پر لکھا ہے: جعفر بن یونس۔ (ص ۶۳-۶۴)

حضرت جنید بغدادی سے متعلق صاحب طبقات الکبریٰ کہتے ہیں:

آپ کے والد ماجد شیشہ بیچتے تھے اس لیے شیشہ والے کہلاتے تھے یہ اصل میں نہاوند کے تھے مگر ان کا مولد و منشا عراق ہے۔فقیہہ تھے

[1] الطبقات الکبریٰ ص ۲۰۹

اور ابو ثور کے مذہب پر تھے جو امام شافعی کے ہم صحبت اور ان کے مذہب کے قدیم راوی ہیں[1]

تقریباً یہی الفاظ نفحات الانس میں مولانا عبدالرحمان جامی نے بھی لکھے ہیں۔ پھر آپ فرماتے ہیں:

باسری سقطی و حارث محاسبی و محمد قصاب صحبت داشتہ بود و شاگرد ایشاں بود از ائمہ و سادات ایں قوم است و ہمہ نسبت بوے درست کنند[2]

شہزادہ دارا شکوہ سفینۃ الاولیا میں اس کی توضیح کرتے ہیں:

رویم و ابوالحسن نوری شبلی خراز وغیرہ اکابر اولیا و مشائخ اپنے سلسلوں کی ان کی طرف نسبت کر کے درست کرتے ہیں[3]

حضرت فریدالدین عطار نے لکھا ہے:

و بریں طائفہ سبقت داشت و از اوّل حال تا آخر روزگار پسندیدہ بود و مقبول و محمود ہمہ فرقہ بود[4]

جس کی شرح یہ ہے:

حضرت شیخ جنید ظاہر و باطن میں شرع کے خلاف نہیں کرتے تھے۔

---

[1] علامہ عبدالوہاب شعرانی ص ۷۲ (۱۷۲)

[2] نفحات الانس ص ۵۳

[3] سفینۃ الاولیا ص ۵۹

[4] تذکرۃ الاولیا ورق ۲۷۵ ب باب چہل و سوم (قلمی)

اور جب کشف المحجوب کا تجزیہ عام روش سے ہٹ کر کیا جائے گا تو حضرت مخدوم کی حیات و تعلیمات کے اجزاء میں جو اس طرح مرتب ہوں گے ضرور حضرت ابوبکر شبلی، حضرت جنید بغدادی، ابو الفضل محمد بن حسن الختلی اور ابو الحسن حصری کے عکس جمیل برابر نظر آئیں گے۔

حضرت مخدوم کے اساتذہ

حضرت مخدوم نے علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل میں اپنے چند در چند استادوں کا ذکر کشف المحجوب میں کیا ہے۔ آپ حضرت ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری کا ذکر کرتے ہیں تو لفظ اُستاد بڑھاتے ہیں اور عام طور پر خیال یہی ہے کہ آپ نے حضرت ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن صاحب رسالہ قشیریہ کے سامنے بھی زانوئے ادب تہ کیا۔

ڈاکٹر ظہور الدین احمد لکھتے ہیں:

انہوں نے استاد ابوالقاسم قشیری سے بھی استفادہ کیا۔[1]

حضرت مخدوم کشف المحجوب میں ایک حکایت کے بیان میں لکھتے ہیں:

مصنّف گوید از استاد ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ شنیدم کہ گفت مرداں از فقر و غنا سخن گفتہ۔

حضرت ابوالقاسم قشیری کے علاوہ حضرت مخدوم نے ابوالعباس بن محمد الاشقانی، ابوجعفر محمد بن المصباح صیدلانی ابوالقاسم بن عبداللہ گرگانی کا ذکر بڑے ادب سے کیا ہے ابوالعباس احمد بن محمد القصاب، ابوعبداللہ محمد بن علی المعروف بالداستانی کو بھی جنہیں پروفیسر شیخ عبدالرشید نے غلطی سے داغستانی لکھ دیا ہے، استادوں کے زمرے میں

---

[1] پاکستان میں فارسی ادب

شامل کیا ہے۔

شہزادہ داراشکوہ نے سفینۃ الاولیا میں شیخ ابوسعید ابوالخیر اور علامہ سید عبدالحیٔ نے نزہت الخواطر میں ابوعلی فضل بن محمد فارمدی کا اس فہرست میں اضافہ کیا ہے۔

مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں :

——— وشیخ علی سوائے ابوالفضل پیر خود با حضرت ابوالقاسم گرگانی ابوسعید ابوالخیر وابوالقاسم قشیری ودیگر مشائخ عظام صحبت ہا داشت وفوائد کثیر برداشت [1]

اپنے استادوں سے متعلق حضرت مخدوم کی رائے دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی۔ اس میں خاص کر ان فوائد کی طرف بھی رہنمائی ہوگی جن کا ذکر مفتی غلام سرور لاہوری کرتے ہیں۔

حضرت ابوالعباس بن محمد الاشقانی سے متعلق حضرت مخدوم لکھتے ہیں :

مرا با وے انسی عظیم بود و وے را بر من شغفی صادق واندر بعضی علوم استاد من بود ہرگز تا من بودم از ہیچ صنف کسے ندیدم کہ شرع را نزدیک وے تعظیم بیشتر ازاں بود۔ [2]

حضرت ابوجعفر محمد بن المصباح صیدلانی سے متعلق فرماتے ہیں :

از رؤسامی متصوف بود و زبانی نیکو داشت اندر تحقیق ومیل عظیم بحسین بن منصور وبعضی از تصانیف وی بر وخواندم۔

شیخ ابوالقاسم بن علی عبداللہ گرگانی سے متعلق لکھا کہ :

---

[1] ج ۲ ص ۲۳۲ خزینۃ الاصفیاء

[2] کشف المحجوب ص ۲۳۴

ان سے میں نے عجز و نیاز کی تعلیم حاصل کی تھی اور وہ قطب زمانہ و
یگانہ عصر تھے۔

پھر فرمایا:

مرا با وے اسرار بسیار بود اگر بہ اظہار آیات وے مشغول گردم از
مقصود بمانم۔

آمل و طبرستان کے شیخ ابوالعباس احمد بن محمد القصاب سے متعلق فرمایا:

محمد بن عبداللہ طبری کے مرید تھے۔ امّی تھے مگر گفتگو معارف و نکات سے
مزیّن ہوتی تھی۔

حضرت مخدوم نے عالمِ اسلام میں دُور دُور سفر کیے تھے۔ وقت کے سبھی علماء و صلحائے سے فیض اور برکتیں حاصل کی تھیں اور اولیاء اللہ کے مزاروں پر چلّہ کشی سے باطنی جِلا پائی۔ حضرت مخدوم نے صرف خراسان میں تین سو سے زائد استادوں سے فیض پایا اور آپ کے اساتذہ کی مکمل فہرست مرتّب نہیں کی جاسکتی۔

صرف چند ایک کا ذکر ہی آپ نے کتاب کشف المجوب میں کیا ہے اور ضرور شام، فارس، آذربائیجان، قہستان، طبرستان، کرمان، خراسان، ترکستان کے علاوہ غزنی کے صوفیائے کرام سے بھی آپ نے فیض پایا ہوگا۔ کشف المحجوب کی مدد سے مرتب کردہ فہرست میں حکیم سید امین الدین احمد چوالیس استادوں کا ذکر کرتے ہیں۔ حضرت عبدالماجد دریابادی فرماتے ہیں:

سیر و سیاحت میں اکثر رہا کرتے تھے۔ شام سے لے کر ترکستان
اور ساحل سندھ سے لے کر بحر قزوین تک یعنی اپنے زمانہ کی تقریباً

ساری اسلامی عمل داری کی سیاحی کا ذکر کیا ہے۔ آذربائیجان، بسطام، دمشق، رملہ، بیت الجن، طوس، منہہ اور جبل اسلام کے نام اپنے سفرنامہ میں تصریح کے ساتھ لیے ہیں۔[1]

علامہ سیّد عبدالحی حسنی صاحب نزہت الخواطر لکھتے ہیں:

بعد از فراغ مشہور اسلامی شہروں کی سیر کی اور حج بیت اللہ و زیارت روضہ نبویؐ سے متمتع ہوئے۔[2]

حضرت مخدوم حج و زیارات، صحبت علماء و صلحاء تحصیل علم ظاہری و باطنی جہاد اور اشاعت دین کے لیے سفر کو واجب جانتے تھے۔ آپ نے عالم اسلام میں دُور دُور سفر انھی بلند مقاصد کی تکمیل کے سلسلے میں کیے۔ غلام سرور لاہوری نے لکھا ہے:

جامع بود میان علم ظاہر و باطن و زہد و ورع و تقویٰ و ریاضت و کرامت و خوارق در ولایت و اتحاد مدارج بلند و مقامات ارجمند داشت۔[3]

اور یہ سب کچھ آیت قرآنی سیروا فی الارض پر عمل کی بدولت تھا۔

---

[1] تصوف اسلام ص ۳۲

[2] نزہت الخواطر ج ا ص ۱۵۱-۱۵۲

[3] خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۲۳۲

ورودِ لاہور

فوائد الفواد میں حسن سجزی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کے حوالے سے حضرت مخدوم کے لاہور ورود مسعود کے سلسلے میں روایت بیان کرتے ہیں،

شیخ حسین زنجانی و شیخ علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہما ہر دو مرید یک پیر بودہ اند و آں پیر قطب عہد بودہ است شیخ حسین زنجانی از دیر باز ساکن لہاور بود بعد از چند گاہ پیر ایشاں خواجہ ہجویری را فرمودند کہ در لہاور رو و ساکن شو۔ شیخ علی عرض داشت کہ حسین زنجانی آنجا است پیر فرمود تو برو و چوں علی ہجویری بحکم اشارات ایشاں در لہاور در آمد شب بود بامداداں جنازہ شیخ حسین زنجانی را بیروں آوردند۔

اس روایت کو تذکرہ والوں نے بلا تکلف متواتر نقل کیا ہے حسن سجزی کے بیان میں کسی کو شک و شبہ کی وجہ بھی نظر نہیں آئی۔ غلام سرور لاہوری کم و بیش فوائد الفواد کے الفاظ ہی میں اس قصہ کو بیان کرتے ہیں:

پس از تشریف آوری مخدوم علی ہجویری خواجہ حسین زنجانی کہ وے ہم مرید و خلیفہ شیخ ابوالفضل بن حسن ختلی بود بہ قطبیت لاہور مامور بود من بعدہٗ بہ مخدوم علی ارشاد شد کہ بہ لاہور رو و در آنجا مقام پزیرد و

علی مخدوم بجواب پرداخت کہ برادرم حسین زنجانی پیش ازیں در لاہور

ماموراست حالا ماموری بندہ چہ حکمت است شیخ ابوالفضل فرمود

کہ تو بروو در آنجا ساکن شو ترا پرسیدن حکمت چہ کار چوں مخدوم حسب

ایمائے پیر روشن ضمیر در لاہور رسید شب بود بیروں شہر مقام فرمود

بامداواں کہ داخل شہر شد دید کہ مرداں جنازہ فیض اندازہ حسین

زنجانی بر دوش می آیند کہ بہماں شب حسین زنجانی برحمت ربانی

پیوستہ بود پس ہمراہ جنازہ شد و بمقام مدفن حسین تشریف بردہ حسین را

چوں گنج حوالہ خاک نمود۔[1]

حضرت عبدالماجد دریا بادی امیر حسن علاء سجزی کے حوالے سے اس روایت کو درست مان کر بیان فرماتے ہیں اور اس کے قرینِ قیاس ہونے کی دلیل دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کو مرشد کے حکم سے مسکن بنایا تھا۔ خود کشف المحجوب کی عبارت سے ایسا مترشح ہوتا ہے کہ لاہور کا مقام مرضی کے خلاف کسی مجبوری سے تھا۔[2]

اپنے رسالہ حیات و تعلیمات حضرت داتا گنج بخش میں جناب پروفیسر شیخ عبدالرشید حضرت مخدوم کی لاہور میں آمد کی مجبوری سے متعلق یہی روایت بیان کر کے کشف المحجوب سے شکایت حالات میں عبارت نقل کر دیتے ہیں۔

---

[1] خزینۃ الاصفیاء ج ۲ ص ۲۳۳

[2] تصوفِ اسلام ص ۳۲

حسین زنجانی تاریخ و تذکرہ صوفیہ میں گم نام ہستی نہیں ہیں۔ قدیم و جدید تذکرہ والے سبھی آپ سے واقف ہیں۔ محمد اعجاز طفیل روزنامہ امروز کی اشاعت ملّی میں لاہور کی عظیم روحانی شخصیت کے عنوان سے حضرت سید میراں حسین زنجانی کے حالات بیان کرتے ہیں:

آپ کا اصل نام شیخ فخرالدین شاہ حسین زنجانی تھا لیکن آپ میراں حسین رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔ حضرت میراں حسین زنجانی ۳۳۶ھ ربیع الاوّل بوقت صبح زنجان میں سید علی محمود کے گھر پیدا ہوئے۔ حضرت حسین زنجانی نے قرآن و تفسیر، حدیث و فقہ کی تعلیم حاصل کی۔ دوران تعلیم میں سیّد صاحب کو اسرار باطنی حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا جس کی تکمیل ۲۴ برس کی عمر میں تمام علوم سے بہرہ ور ہونے کے بعد شروع کی۔ آپ حضرت ابوالفضل الختلی کے مرید ہوئے۔ علوم ظاہری اور باطنی پر عبور پایا تو شیخ نے انہیں ہندوستان بھیجا۔ اس سفر کا آغاز آپ نے ۳۸۵ھ میں کیا اور آپ زنجان سے چلے۔

صاحبِ مقالہ نے ان منزلوں کا نام بنام ذکر کیا ہے جن سے گزر کر حضرت حسین زنجانی لاہور آئے اور شہر کی شرقی جانب قیام فرمایا جسے اب 'چاہ میراں' کا نام دیتے ہیں جہاں ۴۳۱ھ میں آپ مالکِ حقیقی سے جا ملے۔

اس طرح حضرت حسین زنجانی نے ۲۴ سال علوم ظاہری اور ۲۴ سال علوم باطنی کے حصول میں صرف کیے۔ تقریباً ۵۰ سال کی عمر میں آپ نے لاہور کا رُخ کیا جہاں آپ ۴۵ سال تبلیغِ دین میں مصروف رہے اور کچھ کم سو سال کی طویل عمر میں انتقال فرمایا۔

محمد اعجاز طفیل صاحب نے اپنے ماخذوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔

محمد وارث کامل داتا گنج بخش کے سوانحی خاکہ میں حسین زنجانی کو سلسلہ جنیدیہ میں بیعت مانتے ہیں اور ان کی آمد لاہور کا سن ۳۹۵ھ دیتے ہیں۔ حسین زنجانی کے جنازے میں حضرت مخدوم کی شرکت تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اگر یہ واقعہ تسلیم کر لیا جائے اور یقیناً صحیح ہے۔ اس لیے کہ اس کے قدیم ترین اور معتبر راوی حضرت سلطان نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ ہیں[1]

حضرت سلطان نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی کی امانت و دیانت کا ذکر کرتے ہوئے محمد وارث کامل صاحب لکھتے ہیں:

> اس مقدس شخصیت اور سلطان الہند حضرت خواجہ غریب نواز کے درمیان دو واسطے ہیں[2]

خواجہ قطب الدین بختیار کاکی اور حضرت فرید الدین مسعود گنج شکر سے جو ہدایات آپ کو ملی ہوں گی ان کی بنا پر جناب محمد وارث کامل دلیل لاتے ہیں:

> قدیم صوفیائے کرام کے بارے میں جو معلومات (انہوں نے) حاصل کی ہوں گی اصول درایت کی روشنی میں غیر معتبر نہیں قرار دی جا سکتیں[3]

---

[1] داتا گنج بخش سوانحی خاکہ ص ۳۷

[2] ایضاً ص ۳۸

[3] ایضاً

پھر لکھتے ہیں :

حضرت خواجہ غریب نواز نے لاہور کے مزارات اور اصحاب مزارات کے حالات اور واقعات کی ضرور تحقیق کی ہوگی۔ مراقبات کے ذریعہ یا لاہور کے مشائخ وقت سے[۱]

غلام سرور لاہوری خزینۃ الاصفیا میں حضرت حسین زنجانی کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں جامع علوم ظاہری و باطنی کے ساتھ خاندان عالیہ جنیدیہ میں بیعت مانتے ہیں۔

وبہ ہمراہی سید یعقوب صدر دیوان زنجانی از زنجان در لاہور آمد و خلق کثیر بحلقہ ارادت وے در آمد وفات وے باقوال صحیحہ در سال شش صد ہجری است[۲]

حضرت سید یعقوب صدر دیوان زنجانی کے ذکر میں مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں :

بایمائے غیبی در سال پانصد وسی و پنج ہجری از ترکستان در ہند تشریف آوردہ در لاہور سکونت فرمود[۳]

مفتی غلام سرور لاہوری بہ زمانہ معزالدولہ بہرام شاہ بن مسعود شاہ بن ابراہیم غزنوی کے نائب لاہور طغرل کا بتلاتے ہیں جو آپ پر اعتقاد رکھتا تھا۔

صاحب خزینۃ الاصفیا نے خواجہ بزرگ حضرت معین الدین چشتی سے آپ کی

---

[۱] ایضاً

[۲] ایضاً

[۳] ج ۲ ص ۲۵۲

ملاقات کا ذکر کیا ہے۔

ونیز دراں ایام حضرت خواجہ معین الدین حسن سجزی تشریف آور لاہور شدہ و در مزار گوہر بار پیر علی مخدوم ہجویری اعتکاف ورزیدہ باہم سید یعقوب زنجانی و خواجہ بزرگ معین الدین ہم نہایت محبت و التفات بوقوع آمد چنانچہ تا حال مقام نشست گاہ خواجہ بزرگ متصل مزار سید یعقوب زیارت گاہ خلق است[1]

مفتی غلام سرور لاہوری حضرت سید یعقوب صدر دیوان زنجانی کی وفات معتبر و صحیح اقوال کے مطابق ۶۰۴ھ بتلاتے ہیں۔

تحقیقاتِ چشتی کے مطابق سید حسین زنجانی حضرت سید یعقوب صدر دیوان زنجانی کی ہمراہی میں لاہور آئے اور ورود کا سن زمانہ بہرام شاہ غزنوی ۵۴۵/ ۵۵۰ ہجری تحقیق ہے۔

سفینۃ الاولیا از داراشکوہ میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے تذکرہ میں سید حسین زنجانی سے آپ کی ملاقات کا ذکر موجود ہے:

خواجہ معین الدین چشتی نے دُور دُور ممالک کا سفر کیا اور بڑے بڑے مشائخ سے آپ نے فیض حاصل کیا۔ چنانچہ حضرت غوث الثقلین رضی اللہ عنہ سے جیلان میں ملاقات کی اور تقریباً چھ مہینے ان کی خدمت میں رہے۔ ان کی صحبت سے آپ نے فیوض و برکات حاصل کیں۔ بخارا میں شیخ خواجہ یوسف ہمدانی سے تبریز میں شیخ ابوسعید تبریزی

---

[1] خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص ۲۵۳

اور لاہور میں شیخ حسین زنجانی سے ملاقات کی۔

سفینۃ الاولیا کے مطابق حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی ولادت کا سال ۵۳۰ھ اور سنِ وفات ۶۳۳ھ ہے۔

خزینۃ الاصفیا کی روایت جس میں حسین زنجانی کے جنازے میں حضرت مخدوم کی شرکت کا ذکر ہے اور صحیح اور معتبر اقوال کے مطابق حسین زنجانی کی وفات سن ۶۰۰ھ میں تضاد موجود ہے کہ حضرت مخدوم کو حسین زنجانی کا لاہور میں جانشین اور ان کے بعد شاہ ولایت ماننے میں ان کا سنِ وفات ۴۳۱ھ ماننا پڑتا ہے۔

میاں طفیل محمد نے اس روایت کو بلا تکلف اپنے اُردو ترجمہ کشف المحجوب میں مان لیا ہے۔ حضرت مخدوم کی حیات و تعلیمات کے سلسلے میں ان کی واقفیت کا درجہ بالکل معمولی ہے۔ کشف المحجوب کا کوئی فارسی نسخہ بھی ان کے پیش نظر نہیں۔ انہوں نے اُردو ترجمہ کشف المحجوب سے اپنا اردو ترجمہ ترتیب دیا ہے۔ پروفیسر شیخ عبدالرشید نے بلا تحقیق و تفتیش اس روایت کو قبول فرما لیا ہے۔ جناب محمد وارث کامل کے دلائل میں جو وزن ہے وہ ظاہر ہے بعض مسئلے ایسے بھی ہوتے ہیں جو صرف عقیدت سے حل نہیں ہوتے۔ مولانا دریابادی پر البتہ حیرت ہوتی ہے کہ ان کی نظر کشف المحجوب کے مندرجات پر بھی ہے۔ حضرت مخدوم نے فرمایا؛

و آں روز کہ وے را وفات آمد بہ بیت الجن بود و آں دہے است
بر سر رودِ دمشق سر بہ کنار من داشت۔

حضرت مخدوم پیر مرشد کا ذکر کر رہے ہیں۔ آپ کی وفات کے وقت بیت الجن (ملک شام) میں حضرت مخدوم موجود تھے یہ سن ۴۶۰ھ کا واقعہ ہے۔ اس روایت کے

موجب حضرت مخدوم آپ کی زندگی میں لاہور آ گئے تھے حضرت دریابادی جیسے محقق و ادیب کے لیے شک و شبہ کو ہوا دینے کو صرف یہی کافی تھا۔ حضرت مخدوم کے دوسرے سوانح نگار کے لکھنے والوں کا خیال اس طرف ضرور گیا ہے۔ انہوں نے اس معمّہ کا حل بھی پیش کیا ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر داتا صاحب کے ورود لاہور کا سن ۴۳۱ھ مان لیا جائے تو ۴۶۰ھ میں داتا صاحب دمشق میں کیسے تھے جبکہ مرشد کی وفات کا واقعہ آپ نے کشف المحجوب میں لکھا ہے اس سے یہ بات ذہن نشین کرائی جاسکتی ہے کہ داتا صاحب سولہ سترہ برس لاہور رہنے کے بعد وقتی طور پر مرشد کے انتقال کے وقت دمشق پہنچ گئے ہوں گے اور دوبارہ واپس آئے ہوں گے۔[1]

بہرحال تذکرہ والوں کی اس روایت کو ماننے کی وجہ حضرت سلطان نظام الدین اولیا محبوب الٰہی کی ذات گرامی ہے جن سے حضرت علاء سجزی نے روایت منسوب کی ہے مگر اکثر اہل تحقیق نے اس حکایت اولیاء کا تجزیہ کر کے اسے تسلیم نہیں کیا ہے۔ محمد حسن گیلانی کتاب 'حضرت داتا صاحب کے حالات زندگی' میں اس روایت سے متعلق لکھتے ہیں:

یہ اطلاع مصدقہ نہیں کیونکہ داتا صاحب کے معاصرین میں شیخ حسین زنجانی نام کے کوئی بزرگ نہیں گزرے البتہ اس نام کے بزرگ کا مقبرہ لاہور میں محلہ مصری شاہ میں واقع ہے۔ آئین اکبری کے مطابق اس بزرگ کی تاریخ وفات ۶۰۰ھ ہے۔[2]

---

[1] مرکز تجلیات ص ۴۶

[2] پاکستان میں فارسی ادب ص ۱۲۳

ڈاکٹر محمد اسلم اپنے مقالہ بہ عنوان 'داتا گنج بخش کی لاہور میں آمد' میں لکھتے ہیں :

ہمارے خیال میں یہ روایت سراسر غلط اور الحاقی معلوم ہوتی ہے۔[۱]

ڈاکٹر صاحب نے اس دعویٰ کے سلسلے میں پہلا ثبوت یہ دیا ہے کہ ہمارے بزرگوں کی تصانیف میں بہت کچھ الحاقی مواد شامل کر دیا گیا ہے بلکہ جعلی کتابیں ان کے نام سے منسوب کر دی گئی ہیں۔ پھر لکھتے ہیں :

جہاں تک تاریخی شواہد کا تعلق ہے شیخ حسین زنجانی اور سید علی ہجویری ہم عصر نہیں بلکہ شیخ حسین زنجانی اور خواجہ معین الدین حسن اجمیری ہمعصر ہیں ۔[۲]

سیر العارفین ، عمل صالح اور سفینۃ الاولیاء کے حوالے سے پروفیسر جناب محمد اسلم یہ بھی دکھلاتے ہیں کہ شیخ حسین زنجانی اور خواجہ معین الدین چشتی میں کمال درجہ محبّت تھی۔

اور جن ایام میں خواجہ صاحب لاہور میں حسین زنجانی کے ساتھ مقیم تھے اس وقت داتا صاحب کو فوت ہوئے تقریباً ایک صدی گزر چکی تھی ۔

نتائج جو ڈاکٹر محمد اسلم صاحب نکالتے ہیں ہمارے نتائج سے مختلف نہیں ہیں کہ حضرت شیخ زنجانی کا جنازہ حضرت مخدوم کے سامنے اُٹھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حسین زنجانی کا انتقال ۶۰۰ھ میں ہُوا حضرت مخدوم کے سنِ وفات میں مرجح قول ۴۶۵ھ ہے حضرت مخدوم ۴۰۶ھ میں مرشد کے ساتھ دمشق میں تھے ۔ حضرت حسین زنجانی ۵۵۰ھ میں لاہور تشریف لائے ۔ کوئی امکان قطعی نہیں ہو سکتا کہ حضرت مخدوم جنازے میں شریک

---

[۱] تاریخی مقالات ص ۲۸۰ [۲] ایضاً ص ۲۸۲

ہو کر داخلِ ثواب ہوئے یا انھیں مرشد نے حضرت حسین زنجانی کے بعد لاہور کا شاہ ولایت مقرر کر کے بھجوایا تھا۔ تذکرہ حسین زنجانی میں علاّمہ سیّد عبدالحئی حسنی لکھتے ہیں:

فقیہہ شب زندہ دار تھے، فخرالدین لقب تھا۔ لاہور سے نسبت تھی۔ مشہور مشائخ میں سے تھے۔ انہوں نے علوم اور طریقت دونوں شیخ ابوالفضل محمد بن حسن الختلی سے حاصل کیے اور برسوں اُن کے ملازم خدمت رہے، پھر ہندوستان تشریف لائے اور لاہور اپنا وطن قرار دیا۔ جس روز شیخ علی بن عثمان ہجویری صاحب کشف المحجوب لاہور ان کی زیارت کے لیے حاضر ہوئے۔ شیخ زنجانی نے اسی روز داعیِ اجل کو لبیک کہا۔[1]

شیخ ابوالفضل محمد بن حسن الختلی حضرت مخدوم کے مرشد ہیں۔ قوسین میں علامہ سید عبدالحئی حسنی بروایت فوائدالفواد حسن سجزی لکھتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے تحقیق نہیں فرمائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ روایت درست ہوتی کہ حضرت مخدوم شاہ حسین زنجانی کے پیر بھائی تھے اور مرشد کے حکم سے ان کی وفات پر شاہ ولایت بنا کر لاہور بھیجے گئے تھے تو قریبی روابط کی بنا پر کشف المحجوب میں حضرت مخدوم ان کا ذکر ضرور فرماتے۔ کشف المحجوب اس سلسلہ میں قطعی خاموش ہے۔

غزنی میں بدامنی حضرت مخدوم کی ورودِ لاہور کی تاریخی وجہ تھی جس میں بلاشبہ وہ عنصر موجود نہیں جو فوائدالفواد کی روایت میں ہے لیکن حقیقت اکثر سادہ اور صاف ہوتی ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غزنی میں ان حالات کا تاریخ کی روشنی میں احاطہ کر لیا جائے

---

[1] نزہت الخواطر ج ا ص ۱۴۷-۱۴۸

جن کی وجہ سے حضرت مخدوم نے ہندوستان کی طرف مراجعت فرمائی اور شہر لاہور کو قیام سے شرف بخشا، جس کے باعث شہر لاہور کو داتا کی نگری بھی کہتے ہیں۔

امیر ناصر الدین سبکتگین سے متعلق صاحب جامع التواریخ لکھتے ہیں:

اعیان غزنین آثار رشد بر ناصیہ سبکتگین مشاہدہ نمودہ او را در سنہ سہ صد وشصت و پنج برخود ہا حاکم گردانیدند[1]

سبکتگین نے اپنے آقا کی لڑکی سے شادی کی اور فتوحات شروع کیں۔

و در سنہ رفتہ چند قلعہ معتبرہ آں مملکت بہ تسخیر درآورد و جے پال راجہ سند بالشکر بسیار مقابلہ ساختہ انہزام یافت[2]

جے پال کو صاحب جامع التواریخ نے راجہ سندھ لکھا ہے۔ جے پال والئ لاہور تھا۔ ۳۸۷ھ میں سلطان محمودؒ باپ کا جانشین ہوا اور فتوحات کا سلسلہ جو امیر سبکتگین نے شروع کیا تھا۔ سلطان محمود نے سومناتھ کی بُت شکنی کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔

محمود کی زندگی کی زبردست خواہش فتح اور حکومت کی توسیع تھی اور اسی میں اس نے ساری زندگی صرف کردی[3]

سن ۴۱۲ھ میں لاہور سلطنت غزنی میں شامل کرلیا گیا۔ سلطان محمود کا عہد حکومت غزنی کے لیے سنہری زمانہ تھا۔ سلطان محمود کی فتوحات، مالِ غنیمت، مندروں کی توڑپھوڑ، کافروں کا قتل وغارت اس کے جذبۂ جہاد سے جُدا نہیں کیے جاسکتے۔ علامہ سید عبدالحیؒ حسنی لکھتے ہیں:

---

[1] ص ۱۸۸   [2] ایضاً   [3] آبِ کوثر ص ۲۲ بحوالہ تاریخ ہند ڈاکٹر تارا چند

سلطان محمود صاحب عقل و دانش متدین اور دین دار تھا وہ علم اور
اس کے ماخذ جانتا تھا[1]

صاحب نزہت الخواطر کے مطابق سلطان صاحبِ تصنیف بھی تھا۔ اس سلسلہ میں اس کی کتاب التفریہ کا ذکر آیا ہے۔ یہ کتاب نواح غزنی میں متداول تھی اور فقہ کی کتاب تاتارخانی میں اس سے مسائل نقل کیے گئے ہیں۔

سلطان محمود نے بے شمار جنگیں لڑیں، رعایا کے ساتھ مالی احسان
کیا اور ان کے معاملات میں حُسنِ سلوک سے پیش آیا، جہاد سے کبھی
مُنہ نہ موڑا، کسی مصنف نے سلطان کی اس خُوبی پر حرف گیری نہیں
کی ہے[2]

سلطان محمود کی وفات کے ساتھ ہی بدامنی کا دور دورہ ہوا۔ امیر محمد اور سلطان مسعود میں تخت نشینی کی جنگ ہوئی۔ سلجوقیوں اور ترکمانوں کا خطرہ بڑھتا گیا۔ سن ۴۲۹ھ میں سلطان مسعود کی مہمات ہندوستان پر غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر ترکمانوں نے غزنی کا محاصرہ کرلیا۔

و سلطان مسعود از سفر ہند باز آمدہ چند نوبت با سلجوقیاں محاربہ نمودہ
آخر منہزم گشتہ پسر خود مودود را در بلخ گذاشتہ خود بطرف ہندوستان
رفت۔

یہ ۴۳۱ھ کا واقعہ ہے جو سن حضرت مخدوم کے ہندوستان کی طرف مراجعت فرمانے کا ہے۔ جناب پروفیسر شیخ عبدالرشید لکھتے ہیں:

---

[1] نزہت الخواطر ج ۱ ص ۱۶۳ [2] ایضاً

یہ وہ دور تھا کہ ایک طرف سلجوقی خاندان نے مجبور کیا اور دوسری
طرف ہندوستان کے ہندو راجاؤں کی مزاحمت نے غزنوی حکومت
کو پارا پارا کر رکھا تھا خود غزنی میں زندگی بسر کرنا مشکل ہو گیا تھا۔
غزنی کی تباہی سلطان علاءالدین جہاں سوز کے ہاتھوں چند سال بعد مکمل ہو گئی۔ ہندوستان میں حالات نسبتاً بہتر تھے۔ حضرت مخدوم غزنی سے بامر مجبوری نکل آئے۔ صاحب آبِ کوثر لکھتے ہیں:

مختلف اسلامی ملکوں کے سفر کے بعد سلطان مسعود ابن سلطان محمود غزنوی کے اخیر عہد حکومت میں دو ساتھیوں کے ہمراہ لاہور تشریف لائے۔ [1]

حضرت مخدوم کے ان دو ہمراہیوں کے نام شیخ احمد حمادی سرخسی اور ابوسعید ہجویری تھے۔
بعض تذکرہ نگار کہتے ہیں کہ آپ سلطان مسعود کے لشکر کے ساتھ لاہور تشریف لائے لیکن یہ درست نہیں ہے[2]۔ اولیاء اللہ اسلامی لشکروں کے ساتھ ضرور آتے تھے اور جہاں ضرورت سمجھتے تھے تبلیغ دین کی خاطر ڈیرے ڈال دیا کرتے تھے۔ مگر سلطان مسعود ۴۲۹ھ میں ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور ہانسی اور سونی پت کے قلعے فتح کیے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت حضرت مخدوم سلطان مسعود کی ہمراہی میں تشریف نہیں لائے تھے حضرت مخدوم کی رائے درباریوں سے متعلق اچھی نہیں تھی۔ علماء کو (جن کا تعلق دربار سے تھا) آپ پسند نہ فرماتے تھے۔ آپ بادشاہوں کی دوستی پر سانپ اور اژدہے کی

---

[1] حیات و تعلیمات حضرت داتا گنج بخش ص ۲۵

[2] ایضاً ص ۸۶

محبت کو ترجیح دیتے تھے۔[1]

دوسری بار سلطان مسعود نے سن ۴۳۱ھ میں ترکمانوں سے شکست کھانے کے بعد سندھ پار کیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی فوج کی مدد سے واپس آگر ترکمانوں کو نیچا دکھائے۔ سلطان مسعود کے اس دوسرے سفر میں ڈاکٹر ظہور الدین احمد اس امکان سے قطع نظر نہیں کرتے کہ حضرت مخدوم شاید حفظِ راہ کی خاطر سلطان مسعود کے لشکر کے ساتھ آئے ہوں۔ لکھتے ہیں:

ممکن ہے یہ اطلاع صحیح ہو۔ اس اطلاع میں اس امر کی گنجائش رہے گی کہ وہ شاہ مسعود کے ملازم ہو کر یا کوئی منصب قبول کر کے نہیں آئے تھے بلکہ محض حفظ راہ و ہمراہی کی خاطر فوج کے ساتھ آئے تھے۔[2]

حضرت مخدوم نے ہمارے خیال میں عالم اسلام کا سفر کسی لشکر کی حفاظت میں نہیں کیا تھا۔ ہندوستان کے کفر زار میں ڈیرے ڈالنے والوں نے کسی بادشاہ یا اس کے لشکر کی حفاظت کا تبلیغِ دین کے کارِ خیر میں انتظار نہیں فرمایا اور وہ سفر کے عادی ہو چکے تھے کہ کتنے ہی ممالک کی سیاحت کر چکے تھے اور کسی لشکر کے ساتھ سہولتِ سفر کو ذہن میں رکھے بغیر۔

ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کے ابتداء میں تین مراکز تھے۔ سندھ، ملتان اور اُچ۔ سندھ اور ملتان میں جلد ہی اسماعیلیوں کا (جنہیں قرامطہ کہتے تھے) اثر بہت بڑھ گیا۔ جعفر بن محمد بن عبداللہ بن محمد بن عمر (الاطرف) ابن علی ابن ابی طالب

---

[1] کشف الاسرار ص ۲

[2] پاکستان میں فارسی ادب ص ۱۲۳

علیہ السلام نے حجاز سے سفر ملتان کیا شہر پر قابض ہونے کے بعد۔ انہی کی اولاد نے بڑی مدت ملتان پر حکومت کی۔

اور ان میں بادشاہ بھی تھے علماء بھی تھے نساب بھی تھے۔ ان میں اکثر اسماعیلی مسلک کے پیرو تھے۔

ملتان کے حاکم ابوالفتح داؤد کے قلع قمع کے لیے محمود غزنوی نے ملتان پر حملہ کیا تھا اور قرامطہ منصورہ (سندھ) ہٹ آئے تھے۔ سومناتھ سے واپسی پر سلطان محمود نے ان کو وہاں سے اکھاڑ پھینکا۔ اب اشاعت اسلام کے سلسلہ میں قدرتی طور پر لاہور کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی۔

سن ہجری ۳۷۲ تک لاہور میں مسلمانوں کا نام و نشان نہیں تھا۔ صاحب حدود العالم لکھتا ہے:

لاہور شہریست با ناحیت بسیار و سلطانش از دست امیر ملتان است واندر و بازارہا بت خانہ ہا است و درخت چلغوزہ و بادام وجوزہندی بسیار است ہمہ بت پرستند واندر وی ہیچ مسلمان نیست [۱]

یہ زمانہ بھٹی راجپوتوں کے خاندان ہندو شاہیہ کی حکومت کا ہے جے پال کا تعلق اسی خاندان سے تھا۔ جے پال انند پال۔ جے پال (ثانی) ترلوچن پال کی مسلسل شکستوں سے سلطان محمود نے لاہور کو حضرت غزنین سے متعلق کر لیا۔ حکومت غزنی کی طرف سے نہ صرف شہر بلکہ علاقہ لاہور کے لیے سن ۴۱۲ھ کے بعد باقاعدہ سپہ سالار اور قاضی مقرر ہوتے تھے۔ اولین حاکموں میں عبداللہ، ارپاق، احمد بن نیالتگین، ابومنصور بن علی،

---

[۱] نقوش لاہور نمبر مقالہ جناب ڈاکٹر محمد باقر

عطا بن یعقوب ابن الحاجب اور تلک کا ذکر ملتا ہے[1]۔ سب میں نام آور ابوالنجم ایاز تھا، جسے ۴۲۸ھ میں سلطان مسعود نے اپنے بیٹے مجدود کا اتالیق اور نائب السلطنت بنا کر بھیجا۔ ایاز ہی نے ازسرِ نو قلعہ لاہور اور فصیل بنوائی۔

لاہور کے پہلے قاضی ابوالحسن بھی شیرازی تھے۔

اصحابِ رشد و ہدایت میں سب سے پہلے حضرت سید اسماعیل بخاری کا نام نامی ملتا ہے۔ تذکرہ بزرگان لاہور میں جناب غلام دستگیر نامی بحوالہ تحفۃ الواصلین لکھتے ہیں:

> واعظانِ اسلام میں سے لاہور میں سب سے پہلے جو تبلیغِ دینِ حق کے لیے آئے یہی بزرگ تھے[2]۔

سن ۳۹۵ھ میں آپ وارد لاہور ہوئے[3]۔ بعض تذکرہ نگاروں نے سن ۳۲۵ھ لکھا ہے جو درست نہیں۔ صاحبِ حدود العالم کے زمانہ تک کسی مسلمان کا لاہور میں پتہ نہیں ملتا ہے۔ جناب شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

> (شیخ اسماعیل بخاری) یہاں اس زمانہ میں آئے جب ابھی ہندو راجہ حکمران تھا وہ شاید سلطان محمود غزنوی کو خراج دیتا تھا لیکن سلطان نے ابھی لاہور میں اپنا نائب مقرر نہیں کیا تھا۔
>
> (ص ۸۵)

تبلیغِ اسلام میں جو مشکلات آپ کو درپیش تھیں ان کا اب صرف اندازہ

---

[1] حالات کے لیے ملاحظہ ہو نزہت الخواطر سید عبدالحئی حسنی طبقہ خامسہ ج ا ص ۱۹

[3] خزینۃ الاصفیاء

ہی لگایا جا سکتا ہے۔ کنہیا لعل نے آپ کے ورود لاہور کا سن ۴۱۲ھ لکھا ہے اور صاحب مآثر لاہور منشی محمد دین فوق بھی سن قرین قیاس مانتے ہیں۔

بادشاہی افواج کے ساتھ علماء وفضلاء کی ایک کثیر تعداد بھی ہوتی تھی اور یہ بالکل ممکن ہے کہ مولانا شاہ اسماعیل غزنوی فوج کے ہمراہ لاہور آئے ہوں اور خدمتِ دین اور اشاعتِ اسلام کے لیے لاہور کو انہوں نے اپنا وطن بنا لیا ہو۔[1]

حضرت سید اسماعیل بخاری کی آمد لاہور کا جو بھی سن مان لیا جائے سابقون الاوّلون کا شرف آپ ہی کو ملے گا۔

سید اسماعیل بخاری علوم ظاہری اور باطنی میں کمال دسترس رکھتے تھے۔ صاحبِ آبِ کوثر تذکرہ علمائے اسلام کے حوالے سے لکھتے ہیں؛

از عظمائے محدثین و مفسرین بود۔ اوّل کسے است کہ علم تفسیر و حدیث در لاہور بر آورد۔[2]

تاہم سید اسماعیل بخاری صرف علوم و معارف میں یدِ طُولیٰ کے باعث ہی دین کی خدمت میں اس حد تک کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ تذکرہ نگار لکھتے ہیں؛

جو شخص تھوڑی دیر کے لیے ان کی مجلس میں حاضر ہوا کلمہ پڑھے بغیر نہ رہ سکا۔[3]

---

[1] نقوش لاہور نمبر، مآثر لاہور ص ۱۴۶

[2] ایضاً ص ۸۵

[3] داتا گنج بخش سوانحی خاکہ ص ۳۲ محمد وارث کامل

کتاب بزرگانِ لاہور میں پیر غلام دستگیر نامی لکھتے ہیں؛

ان کے وعظ سے ہزاروں کفار داخلِ اسلام ہوئے۔[۱]

مفتی غلام سرور لاہوری کا بیان ہے؛

بروز جمعہ ثانی پانصد و پنجاہ بروز جمعہ ثالث یک ہزار کس در زمرہ توحید داخل گشتند۔

صاحبِ تحقیقاتِ چشتی نے تعداد ہر جمعہ پر کلمہ پڑھنے والوں کی ڈھائی سو کر دی ہے مطلب سبھوں کا یہی ہے کہ لوگ جوق در جوق دین خدا میں داخل ہوتے تھے۔

بلاشبہ اس کی وجہ مقناطیسی حلقہ کی طرح آپ کی شخصیت کا بے پناہ اثر ہو سکتا ہے

اس کی توضیح محمد وارث کامل آرنلڈ کے حوالے سے کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

اس شیخ کی تبلیغ کا عجیب انداز تھا۔ کسی کے پیروں کی آہٹ سنتے تو بس آنکھ اٹھا کر ایک نظر دیکھ لیتے۔ نظر اس قیامت کی ہوتی تھی کہ اس کا وار خالی نہیں جاتا تھا۔[۲]

یہی حلقہ اثر کتنے ہیں ابھی تک قائم ہے۔

مشہور ہے کہ یہاں کوئی رات بسر نہیں کر سکتا۔ جب بھی کسی نے یہاں شب باشی کی جرأت کی اس پر اس بلا کی وحشت سوار ہوئی کہ بھاگتے ہی بنی۔[۳]

---

[۱] داتا گنج بخش سوانحی خاکہ ص ۹۰

[۲] ایضاً ص ۳۱

[۳] ایضاً ص ۳۴

حضرت اسماعیل بخاری نے لاہور میں درسِ قرآن جاری فرمایا ۔ صاحبِ خزینۃ الاصفیا لکھتے ہیں :

از کتب معتبرہ و اقوال صحیحہ ثابت گشتہ کہ شخصی اوّل در لاہور درس کلام مجید خوانندہ شیخ اسماعیل بود۔

سیّد اسماعیل بخاری نے ۴۶ سال اشاعت اسلام فرما کر ۴۴۸ھ میں انتقال فرمایا۔

سالِ وصلش 'فقیہہ محبوب' است
نیز پیر وجیہہ اسماعیل

لفظ مہتاب سے بھی سنِ وفات ۴۴۸ھ برآمد ہوتا ہے ۔

شیخ اسماعیل وُہ مہتاب ہیں
جن کی ضو سے رات صدیوں دن بنی
اے مقدس خطۂ لاہور سُن
شیخ کی ہستی تری محُسن بنی

حضرت مخدوم اور تبلیغِ دین

حضرت سید اسماعیل بخاری کے کارِ خیر کو جاری رکھنے کی سعادت حضرت مخدوم کو ملی۔ لاہور میں آپ نے ایک بلند مقام پسند فرمایا جہاں (کہتے ہیں) املی کا درخت لگا ہوا تھا[1] حکیم سیّد امین الدین احمد یہ جگہ شہر کے مغربی جانب بتلاتے ہیں جہاں ایک مندر کے مقابل آپ نے جھنڈا لہرایا[2]۔ قریب ہی راجو جوگی رہتا تھا جو شہر کے گوالوں سے دُودھ وصول کرتا تھا ورنہ دُودھ کی جگہ خُون بھر آتا تھا۔

حضرت داتا گنج بخش نے فرمایا یہ دودھ ہمیں دے جاؤ اِن شاء اللہ
تمہارے جانور اس سے بھی زیادہ دُودھ دیں گے[3]

جب آپ کا فرمانا درست نکلا تو دُوسرے بھی دُودھ نذرانے لانے لگے اور راجو جوگی کے کاروبار میں خلل آیا۔ وہ خود آیا اور اس نے کرامات کا مطالبہ کیا۔ آپ نے فرمایا:

میں خدا کا عاجز بندہ ہوں اگر ہاں تم میں کوئی کمال ہے تو دکھاؤ[4]۔

---

[1] داتا گنج بخش سوانحی خاکہ ص ۸۳

[2] تذکرہ حضرت علی ہجویری ص ۸۰

[3] میاں عبدالباری اجمیری اشاعت ملی نوائے وقت ، ۱۴ جنوری ۷۱ء

[4] ایضاً

وُہ ہوا میں اُڑنے لگا۔ آپ نے جُوتا اُچھالا جو اُس کے سر پر پڑنے لگا۔ وُہ اترا اور حلقہ بگوش اسلام ہوا۔ یہی شیخ ہندی ہیں جن کی رُوحانی تربیت حضرت مخدوم نے کی۔ تذکرہ نگاروں نے رائے راجو کو لاہور کا نائب السلطنت بھی لکھا ہے۔ محمد وارث کامل تحقیقات چشتی کے حوالے سے ان کا نام رائے راجہ لکھتے اور انہیں سلطان مودود کی طرف سے پنجاب کا نائب حاکم بتلاتے ہیں۔ بشیر احمد سعدی لکھتے ہیں:

رائے راجو جو مودود ابن مسعود غزنوی کی طرف سے لاہور کا گورنر تھا آپ کے علم و عمل اور زہد و تقویٰ کی شان دیکھی تو آپ کے قدموں میں گر کر مسلمان ہوا اور شیخ ہندی کا لقب پا کر آپ کے حلقہ ارادتمندی میں شامل ہو گیا۔[1]

جناب شیخ عبدالرشید حیات و تعلیمات حضرت داتا گنج بخش میں لکھتے ہیں:

معاصرانہ تالیفات میں سلطان محمود کے نائب کی حیثیت سے رائے راجا کا نام نہیں ملتا۔

حضرت داتا گنج بخش نے تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز مسجد و خانقاہ کی تعمیر سے کیا۔ ابتدائے اسلام سے مرکزی حیثیت مسجد ہی کو حاصل رہی تھی۔ جناب ایم۔ اے۔ یزدانی لکھتے ہیں:

آپ پہلے بزرگ تھے جنھوں نے نجی حیثیت میں یہاں مسجد تعمیر کروائی ورنہ اس سے پیشتر تمام مساجد حکمرانوں اور امراء کی سرپرستی میں

---

[1] ص ۸، دس ولی۔ اپنی تازہ تالیف " داتا گنج بخش " میں سعدی صاحب نے لکھا ہے کہ شیخ ہندی بلاشبہ سلطان مودود غزنوی کے زمانہ میں لاہور کے نائب حاکم تھے ان کا نام رائے راجو تھا مگر وُہ جوگی نہیں تھے۔

تعمیر ہوتی تھیں[1]

لاہور کو حضرت غزنین سے متعلق ہوئے تقریباً ۲۰ سال ہو گئے تھے۔ شہزادہ دارا شکوہ نے لاہور کے محلہ طلا کا خاص طور پہ ذکر کیا[2] ہے جس میں مرد اور عورت کئی ہزار حافظِ قرآن رہتے تھے۔ عام مسلمانوں کی نماز گزاری کے لیے مسجدیں لاہور میں ضرور بنی ہونگی یہ کہنا البتہ مشکل ہے کہ ان کی بنا صرف بادشاہوں اور امراء نے کی تھی۔ حضرت مخدوم کی تعمیر مسجد کا ذکر شہزادہ دارا شکوہ نے کیا ہے۔

ایک مسجد آپ نے خود تیار کروائی تھی جس کا محراب دوسری مساجد کی نسبت جنوب کی طرف جھکا ہوا تھا۔[3]

مسجد کے رُخ پر اعتراض ہوا تو آپ نے تعمیر مکمل ہونے کے بعد سبھوں سے اپنی اقتداء میں نماز پڑھوائی اور پھر محراب حرم میں سے سامنے دیکھنے کو کہا تو سامنے کعبۃ اللہ نظر آتا تھا ان دونوں کرامتوں کے علاوہ کرامات حضرت مخدوم کی نشان دہی مختلف تذکروں سے کی جا سکتی ہے۔ صاحبِ سفینۃ الاولیاء لکھتے ہیں:

آپ کے خوارق و کرامات بے شمار ہیں۔

حضرت مخدوم کی مساعی جمیلہ کے مقصد کا تذکروں سے پتہ ملتا ہے۔ اس ضمن میں کشف المحجوب سے رجوع کیا جائے تو واضح مفید مطلب نتائج نکالنے میں مدد ملتی ہے حضرت مخدوم نے ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل فرمایا ہے:

---

۱ داتا گنج بخش بحیثیت ایک عالم

۲ سفینۃ الاولیاء ص ۲۱۰

۳ ایضاً

ہم ایسے زمانے سے آزمائے گئے ہیں جہاں نہ اسلام کے آداب ہیں نہ جاہلیت والی عادتیں نہ مروّت والی خصلتیں۔

پھر فرمایا:

لوگوں نے حرص اور لالچ کا نام شریعت، تکبّر و جاہ و ریاست کی طلب کا نام عزّت، علم ریا کا نام خوفِ الٰہی اور دل میں کینہ پوشیدہ رکھنے کا نام حلم۔ لڑائی جھگڑے کا نام بحث و مباحثہ، ہذیانِ طبع کا نام معرفت، نفسانی باتوں اور دل کی خرابیوں کا نام محبت، خدا کے رستے سے انحراف اور بے دین ہونے کا نام فقر، حق تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے کا نام فنا فی اللہ اور ترکِ شریعت کا نام طریقت رکھا ہے۔

اور فرمایا:

میں نہیں جانتا فارسی کون ہے اور ابوسلمان کون؟ اور انہوں نے کیا کیا اور کیا کہا؟ جو شخص تحقیق و توحید کے خلاف چلتا ہے اس کو دین میں کچھ نصیب نہیں ہوتا۔

حضرت مخدوم کا مقصد وحید اسلامی اقدار کی حفاظت تھا اور کشف المحجوب میں آپ صوفی سے زیادہ فقیہہ معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نے ایمان، توحید، طہارت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ سے متعلق مجتہدانہ بحث کر کے ارکانِ دین کی پابندی اور اتباعِ شریعت کو لازم قرار دیا ہے۔ نکلسن لکھتا ہے:

حضرت مخدوم کو وحدت الوجودی نہیں کہہ سکتے۔ آپ سختی کے ساتھ اس مسئلہ کا ابطال کرتے ہیں کہ انسانی شخصیت خدا میں فنا ہو سکتی ہے

فنا کی مثال آپ کے لیے آگ میں ملنے کی مثال ہے جو چیزوں کی صفات بدل دیتی ہے مگر ان کی ماہیت میں فرق نہیں پڑتا۔[1]

اپنے پیر روشن ضمیر کے ساتھ آپ مقام سکر (جس میں صوفی خود کو بھول کر شطحیات پر اتر آتا ہے) کے قائل نہیں ہیں۔ نکلسن لکھتا ہے:

آپ نے حلاج کو جادوگری کے الزام سے بری رکھا ہے اور کہا ہے ان کے اقوال ظاہری طور پر وحدت الوجودی ہیں۔ آپ نے حلاج کے عقاید کو غلط بتلایا ہے۔[2]

دارا شکوہ لکھتے ہیں:

اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ میرے شیخ جنیدی مذہب رکھتے تھے اور فرماتے تھے سکر بچوں کا کھیل ہے اور صحو مردوں کا کارنامہ۔[3]

حضرت مخدوم کسی صوفی کو خواہ اس کا مقام کتنا ہی بلند ہو احکامِ شریعت کی پابندی سے آزاد ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

اور سماع، وجد و حال اور شاعری میں علامات کے استعمال سے متعلق آپ کی رائے بڑی محتاط ہے۔

صاحب آبِ کوثر شیخ محمد اکرام کی رائے حضرت مخدوم کے اعتقادات و نظریات سے متعلق صائب ہے لکھتے ہیں:

حضرت داتا گنج بخش کی تصانیف میں متاخرین صوفیہ کا غلو یا نیم پخت

---

[1] انگریزی ترجمہ کشف المحجوب پیش لفظ ص ۱۳ [2] ایضاً

[3] سفینۃ الاولیاء ص ۲۰۹

عقاید و خیالات کا طومار نہیں۔

حصولِ مقصد و حفاظت و اشاعت اقدارِ اسلام کے لیے آپ کے انداز کی رہنمائی میں کشف المحجوب میں کسی مسئلہ پر نظر ڈالیے:

> حضرت مخدوم کا انداز شروع ہی سے استادانہ ہے جو شاگردوں کی تعلیم کے لیے موزوں ہے کشف المحجوب کا سوانحی حصّہ بھی زیادہ تر بیانیہ ہے اپنی رائے کے اظہار سے پہلے حضرت مصنّف اس مسئلہ میں عام خیالات کا احاطہ فرماتے ہیں اور اگر ضرورت ہو تو ان کا بطلان کرتے ہیں۔ صوفیانہ مسائل کو حضرت مخدوم ذاتی تجربات کی روشنی میں اُجاگر کرتے ہیں۔[1]

آپ کے طریقۂ تعلیم کا یہ ایک عام انداز ہے۔ حضرت مخدوم بحث کا آغاز آیات قرآنی سے کرتے اور احادیث نبویؐ سے ثبوت لاتے۔ اس کے بعد اقوال و حکایات صوفیہ سے مسئلہ کو ذہن نشین کرانے میں مدد لیتے۔ اس سلسلہ میں ممکن ہوتا تو کوئی ذاتی تجربہ بھی بیان فرما دیتے تھے۔ حضرت مخدوم یہ سب صرف ناقل اور راوی کی حیثیت سے نہیں کرتے تھے آپ کی نظر مسئلہ کے علمی و عقلی پہلوؤں پر برابر رہتی تھی۔ آپ کو معلوم تھا کہ اقوال و حکایات صوفیہ کا کیا وزن ہے۔ اس لیے مناسب جرح کے بعد ردّ و قبول کی سند بھی لاتے تھے۔

نکلسن کا خیال ہے کہ اقوال و حکایات صوفیہ کا سلسلہ روایت زبانی بیانی سے حضرت مخدوم تک پہنچا تھا۔ اس کے باوجود اسے اقرار ہے کہ کتاب اللمع سے جب کشف

---

[1] انگریزی ترجمہ کشف المحجوب پیش لفظ ص ۱۲

المحجوب میں اقتباسات کا مقابلہ و موازنہ کیا گیا تو انہیں لفظ بہ لفظ صحیح پایا گیا[1]۔ فاضل ژدکوفسکی نے دوسری کتابوں کی فہرست مرتب کردی ہے جنھیں کشف المحجوب کا مآخذ مانا جاسکتا ہے۔ جناب ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے آیاتِ قرآنی کے مطالب و تفاسیر میں ان احادیث نبوی میں سے جن سے حضرت مخدوم استدلال کر کے مسئلہ آگے بڑھاتے ہیں وضعی احادیث کی نشاندہی کی ہے شاید جناب ڈاکٹر ظہور الدین احمد کی نظر اس سارے معاملے کے پس منظر پر نہیں ہے۔ علمائے اسلام قرآن و احادیث سے اعمال و اشغال صوفیہ کی تردید کرتے تھے۔ صوفیا نے بھی اپنے اعمال و اشغال کا جواز قرآن و سنّت سے دکھلانا تھا۔ وہ مال کی مذمت میں آیۂ کنز سے استدلال کرتے تھے اور حضرت ابو ذر غفاری کو گواہ لاتے تھے۔ انہوں نے کچھ قرآنی آیات کو اصحابِ صفہ سے خاص کردیا، مثلاً:

ان لوگوں کے ساتھ برابر رہو جو اپنے رب کو صبح و شام پکارتے ہیں۔
کیا تو ان کا ساتھ چھوڑ کر دنیاوی زندگی اور اس کا آرام چاہتا ہے۔

جناب پروفیسر شیخ عبدالرشید حیات و تعلیمات حضرت داتا گنج بخش میں حضرت مخدوم کی اسلامی خدمات کا ذکر بھی کرتے ہیں:

علی ہجویری لاہور میں دن کے وقت تعلیم دیتے تھے اور رات کو طالبانِ حق کو ہدایت کیا کرتے تھے۔ ان کی رہبری سے ہزاروں جاہل عالم بن گئے۔ کافروں نے اسلام قبول کیا۔ گمراہوں نے ہدایت کی راہ پائی۔ دیوانے ہوشمند ہوگئے جن کا علم ناقص تھا کامل ہوئے۔

---

[1] انگریزی ترجمہ کشف المحجوب پیش لفظ ص ۱۲

فاسق و فاجر پارسا بن گئے۔ ان دنوں لاہور علماء کا مرکز تھا جنہوں
نے علی ہجویری کی تعلیم سے فیض پایا تھا۔[1]

حضرت مخدوم نے لاہور میں جو چشمہ فیض جاری کیا تھا اس سے دور دور سیرابی ہوئی پھر زمانہ کے بڑے بڑے صوفیہ نے آپ سے رُوحانی فائدے اٹھائے ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں؛

خواجہ خواجگان حضرت معین الدین چشتی اجمیری اور شیخ المشائخ حضرت باوا فرید گنج شکر جیسے مسلم اکابر نے آپ کے مزار پر چلّے کھینچے اور فیوض و برکات حاصل کیے۔[2]

حضرت خواجہ معین الدین چشتی نے اپنے زمانے کے بہترین علماء اور صلحاء کی صحبت پائی۔ بہاء الدین دوشی، نجم الدین کبریٰ، شہاب الدین سُہروردی، اوحد الدین کرمانی، خواجہ یوسف ہمدانی، حضرت محمود اصفہانی، جلال الدین تبریزی کے علاوہ آپنے حضرت غوث اعظم سے ملاقات کا شرف بھی پایا۔ آپ خواجہ عثمان ہارونی سے بیعت ہُوئے اور خرقہ خلافت پایا۔ مرشد کے ساتھ ہی آپ کو زیارت حرمین کی سعادت نصیب ہُوئی وہیں سے اشارہ پاکر ہندوستان آئے۔

حضرت علامہ اقبال نے حضرت مخدوم اور خواجہ معین الدین چشتی کا ذکر اپنی مثنوی اسرار خودی میں فرمایا ہے:

سیدِ ہجویر مخدومِ امم
مرقدِ او پیرِ سنجر را حرم

---

[1] حیات و تعلیمات داتا گنج بخش ص ۲۶ [2] تصوف اسلام ص ۳۶

بند ہائے کوہسار آساں گسیخت

در زمینِ ہندِ تخم سجدہ ریخت

استاد سعید نفیسی ایک ضروری تصحیح فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

در مقدمہ باید عرض کنم مقصود وی از پیر سجزی کہ در برخی از چاپ ہائے اسرار خودی بخطا پیر سنجر چاپ شدہ است خواجہ معین الدین حسن سگزی پیشوائے معروف طریقہ چشتی در ہندستانست چوں پدران او از مردم سیستان بودند و در فارسی قدیم بآں سگزستان مے گفتہ اند بنام پیر سگزی معروف بودہ است[1]

سگزی ہی سجزی ہے نہ کہ سنجری۔

فیض باطنی کے سلسلہ میں حضرت فریدالدین مسعود گنج شکر کا نام بھی آتا ہے۔ حضرت محدث دہلوی لکھتے ہیں:

خلیفہ خواجہ قطب الدین است و از خواجہ بزرگ معین الحق والدین نیز نعمت یافتہ[2]

حضرت معین الدین چشتی نے حضرت قطب الدین بختیار کاکی کے متعلق فرمایا تھا:

بابا بختیار شہباز عظیم بقید آورد کہ جز بہ سدرۃ المنتہیٰ آشیاں نگیرد۔

علم دین آپ نے ملتان میں مولانا منہاج الدین ترمذی سے سیکھا[3]۔ ملتان سے غزنی اور

---

[1] مجلہ ہلال ج ۴ شمارہ ۱ ص ۱۵ [2] اخبار الاخیار ص ۵۰

[3] اصول و فقہ میں ممتاز القرآن تھے۔ نزہت الخواطر ص ۲۱۵

قندھار آئے۔ شہاب الدین سہروردی، سیف الدین، سعد الدین حمودی، اوحد الدین کرمانی، پھر بہاء الدین زکریا ملتانی سے فیض پایا اور دہلی جاکر شیخ قطب الدین بختیار سے بیعت ہوئے۔ صاحب نزہت الخواطر لکھتے ہیں:

> غالباً ان کے ارشاد پر شہر ہانسی تشریف لائے یہاں بارہ سال تک مجاہدہ و ریاضت میں منہمک رہے جس کے بعد عجیب وغریب خوارق وتصرفات کا ظہور رہا۔[1]

برصغیر کے اور اولیاء اللہ بھی حضرت مخدوم سے فیضیاب ہوئے۔ صاحبِ مرکزِ تجلیات نے خواجہ معین الدین چشتی فرید الدین مسعود گنج شکر کے علاوہ خواجہ باقی باللہ اور حضرت مجدد الف ثانی شیخ اسماعیل اور حضرت میاں میر کے اسمائے گرامی بھی لکھے ہیں۔[2] آج بھی فیض کا دروازہ بند نہیں ہے۔ محتاط اندازے کے مطابق دولتِ خداداد پاکستان میں دو لاکھ سے زیادہ آپ کے مرید دور و نزدیک موجود ہیں۔

۱؎ ص ۳۱۳ ۲؎ مرکز تجلیات ص ۶۰

ازدواج

حضرت مخدوم کی شادی بیاہ کے سلسلے میں مولانا عبدالرحمان جامی، شہزادہ داراشکوہ سید عبدالحئی حسنی بالکل خاموش ہیں۔ تصوف اسلام میں مولانا عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

> قید ازدواج سے ہمیشہ آزادی رہی[1]

اس کی تائید ڈاکٹر ظہور الدین احمد کرتے ہیں:

> جناب سید ہجویری نے شادی نہیں کی اور ساری عمر تجرد میں گزار دی[2]۔

جناب پروفیسر شیخ عبدالرشید حیات و تعلیمات حضرت داتا گنج بخش میں نکلسن کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> نکلسن کا یہ خیال کہ حضرت علی ہجویری نے شادی کی ہوگی، بعید از قیاس ہے۔ (ص ۲۵)

میاں طفیل محمد نے بھی اپنے اردو ترجمہ میں کشف المحجوب کے حوالے سے خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت مخدوم نے تجرد کی زندگی بسر کی جس کی وجوہات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] تصوف اسلام ص ۳۲ [2] پاکستان میں فارسی ادب ص ۲۴

آپ چونکہ اپنی عمر کا بیشتر حصہ سفر اور مسافرت میں رہے اس لیے آپ نے شادی نہیں کی بلکہ تجرد کی زندگی گزاری [۱]

نکلسن اپنے انگریزی ترجمہ کشف المحجوب کے دیباچہ میں رقمطراز ہے :

کشف المحجوب کے ایک ٹکڑے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ آپ کو متاہل زندگی کا مختصر مگر ناخوشگوار تجربہ ہُوا۔

کشف المحجوب کے اسی ٹکڑے سے صباح الدین احمد الٹ نتیجہ نکالتے ہیں:[۲]

تعلقات زناشوئی سے الگ رہے کشف المحجوب میں لکھتے ہیں کہ ایک سال تک کسی سے غائبانہ عشق رہا مگر جب اس میں غلو پیدا ہونے لگا اور قریب تھا کہ ان کا دین تباہ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال لطف سے اس عشق مجازی کے فتنہ سے ان کو بچا لیا۔

محمد دین فوق حضرت مخدوم کی ایک نہیں دو شادیوں پر اصرار کرتے ہیں :

حضرت نے اپنی شادی کا کہیں ذکر نہیں کیا کہ کب ہوئی اور کہاں ہوئی جہاں انہوں نے دوسری شادی کا ذکر کیا ہے اور یہ لکھا ہے کہ : "گیارہ سال خدائے تعالیٰ نے نکاح کی آفت سے بچایا ہوا تھا۔ مقدر نے آخر اس میں پھنسا دیا اور میں عیال کی صحبت میں دل و جان سے بن دیکھے ہی گرفتار ہو گیا" یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ آپ بچپن ہی میں مناکحت کی زنجیروں میں جکڑ دیئے گئے تھے اور پہلی

۱؎ ص ۴۲

۲؎ بزم صوفیہ ص ،

بیوی کے انتقال کے بعد گیارہ سال تک دوسرا نکاح نہیں کیا معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ کی پہلی شادی بھی والدین کی موجودگی ہی میں ہوئی تھی اور دوسری بھی ان کی موجودگی بلکہ یقیناً ان کے اصرار سے ہوئی ہوگی۔[1]

کسی تذکرہ نگار کے پاس واضح ثبوت موجود نہیں ہے سبھوں نے دعویٰ کی بنیاد کشف المحجوب کے مندرجہ ذیل بیان پر رکھی ہے۔

من کہ علی بن عثمان الجلابی ام رضی اللہ عنہ از پس آنکہ مرا حق تعالےٰ یازدہ سال از آفت تزویج نگاہ داشتہ بود ہم بہ تقدیر وی بفتنہ اندر افتادم وظاہر و باطنم اسیر صنعتی شد کہ با من کردندبی آنکہ رویت بودہ بود ویک سال مستغرق بودم چنانکہ نزدیک بود کہ دین بر من تباہ شود تا حق تعالیٰ بہ کمال لطف وتمام فضل خود عصمت را باستقبال دل بیچارہ من فرستادہ برحمت خلاصی ارزانی داشت[2]

حضرت مخدوم کی عبارت مبہم ہے۔ اس سے ایک مطلب نکالا جا سکتا ہے مگر دوسرے معنی بھی ان الفاظ کو اسی آسانی کے ساتھ پہنائے جا سکتے ہیں بعض مندرجہ بالا عبارت کو اس سے پیشتر آنے والی عبارت سے ملا کر پڑھتے ہیں اور اپنے مفید مطلب نتائج نکالتے ہیں:

نخستین فتنہ کہ بر سر آدم علیہ السلام پیدا آمد سبب آں زن بود اندر بہشت

---

[1] سوانح عمری حضرت داتا گنج بخش محمد دین فوق مرحوم ص ۱۴

[2] ص ۵۰۵

ونخستین فتنہ کہ اندر دنیا پدیدار آمد ہم سبب آں زنی بود یعنی فتنہ ہابیل

قابیل وچوں خداوند تعالیٰ دو فرشتہ راخواست کہ عذاب کند ہم سبب

آں زنی گردانید و الی یومنا ہمہ اسباب فتن ہائے دین و دنیائے

زنانند۔[1]

ان دونوں اقتباسات کو ساتھ ملاکر بعض تذکرہ نگار اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ حضرت مخدوم کی رائے ان شواہد کی بنیاد پر عورت ذات سے متعلق اچھی نہیں تھی۔ خدا کی رحمت ان کے شامل حال تھی اس لیے آپ شادی بیاہ کے جنجال میں پھنسنے سے بال بال بچ گئے مگر دوسرے تذکرہ نگار حضرت مخدوم کی عورت ذات سے متعلق رائے کو ان کی زندگی کے تلخ تجربہ سے جدا نہیں کرتے (مثلاً) عبدالماجد دریابادی لکھتے ہیں:

شاید ایک مرتبہ کسی کے خدنگ نظر سے بسمل ہو گئے تھے۔ ایک سال

تک اس زخم کی تڑپ نے بیتاب رکھا لیکن بالآخر فضل ایزدی نے

زخم کا مرہم پیدا کردیا۔[2]

زخم کے اس مرہم کی نوعیت مختلف لوگوں کے نزدیک مختلف ہو سکتی ہے۔ میاں طفیل محمد لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال لطف ومہربانی سے دل پر عصمت و

پاکیزگی کا فیضان فرمایا اور اپنی رحمت سے اس آفت سے بچایا۔

یہ کشف المحجوب کے پیش نظر ٹکڑے کی ترجمانی بڑی حد تک ہے مگر اس زخم کا

---

[1] ص ۵۰۵

[2] تصوف اسلام ص ۳۲

مریم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بالآخر ایک سال کے بعد آپ کامیاب رہے ہوں یہ واقعہ آپ کی حرم محترم کے مرنے کے ۱۱ سال بعد کا ہوسکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت مخدوم محبت میں ایک سال تک سب کچھ بھولے رہے۔ ایک سال بعد دوسری حرم محترم نے انتقال فرمایا اور کاروبار درویشی میں رکاوٹ دُور ہوگئی۔ اشارے مبہم ہیں اور حقیقی تفصیلات نایاب ہیں۔ ایک یا دوسری رائے پر اصرار احتیاط کے تقاضوں کے خلاف ہے۔ سب سے تعجب خیز بیان محمد دین فوق کا ہے کہ پہلی شادی اور دوسری بھی آپ کے والدین کے اصرار سے ہُوئی تھی۔ دوسری شادی کا واقعہ ۴۳۱ھ کے بعد کا ہوسکتا تھا جب آپ لاہور میں مسندِ درس وارشاد کی زینت تھے۔ گیارہ سال تک آپ اس فتنہ سے محفوظ رہے۔ محتاط اندازے کے مطابق بھی آپ نے ۴۴۰ھ سے ۴۵۰ھ کے درمیانی عرصہ میں شادی رچائی۔ اس شادی کے سلسلے میں حضرت مخدوم کے والدین کی مرضی اور اصرار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ سن ۴۵۰ھ تک ان کے حیات ہونے کا امکان نہیں ہے۔ حضرت مخدوم کا مشہور اور راجح سن وفات ۴۶۵ھ ہے۔ حضرت مخدوم کے والدین لاہور میں تشریف فرما نہیں رہے ان کے مزارات غزنی میں ہیں۔ یہ ناقابل یقین ہے کہ والدین صرف آپ کی بڑھاپے میں شادی کرانے کے لیے لاہور تشریف لائے اور پھر غزنی واپس چلے گئے۔ محمد دین فوق مرحوم نے حضرت مخدوم کے والدین پر عام والدین کا گمان کیا ہے جو بچّوں کی شادی اور پوتوں کو گود کھلانے پر جان دیتے ہیں۔ اگر ایک شادی سے اولاد نہ ہو یا خدانخواستہ بیوی مرجائے تو جھٹ پٹ دوسری شادی کے انتظامات شروع کر دیتے ہیں۔ ان قیاسات کو واقعات کا بدل نہیں سمجھا جاسکتا۔ شیخ محمد اکرام آبِ کوثر میں لکھتے ہیں:

آپ کی ازدواجی زندگی سے متعلق صحیح واقفیت نہیں ملتی۔ (ص ۹۰)

کشف المحجوب میں حضرت مخدوم نے ایک "حدیث" بیان فرمائی ہے:

خیر الناس فی آخر الزمان خفیف الحال قیل یارسول اللہ ما خفیف الحال قال الذی لا اھل لہ ولا اولاد لہ۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ حدیث صحیح ہے۔ مگر سوال حدیث کے صحیح یا وضعی ہونے کا نہیں ہے۔ حضرت مخدوم کا اسے صحیح سمجھنا اور بیان فرمانا اس کا ثبوت ہے کہ آپ تجرد (خفیف الحال ہونا) اپنے اور اسی لیے دوسروں کے لیے پسند فرماتے تھے۔

کسی تذکرہ نگار نے حضرت مخدوم کی اولاد کا ذکر نہیں کیا جس سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ یا تو آپ نے شادی نہیں کی تھی یا سلسلہ آگے نہ چل سکا جسے آپ نے خلاصی ارزانی داشت لکھا ہے۔

سالِ وصال

نفحات الانس میں مولانا عبدالرحمان جامی نے حضرت مخدوم کا سن وصال نہیں دیا ہے۔ سفینۃ الاولیا کے مروجہ نسخہ کے اُردو ترجمہ میں جو نفیس اکاڈمی سے شائع ہوا ہے دو مختلف سن وفات ملتے ہیں، سن ۴۵۴ اور ۴۵۶ھ۔ اور یہ اعتباری نہیں۔ ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم لکھتے ہیں:

> داراشکوہ کے خود نگاشتہ نسخہ میں جس کا روٹوگراف پنجاب یونیورسٹی میں ہے سوائے چہار صد اور واؤ اور علامت زیادہ کے کچھ اور درج نہیں ہے۔

ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم نے درست نتیجہ نکالا ہے کہ اس نسخہ کی تحریر کے وقت سن وصال کی تحقیق مصنف کو نہیں تھی پھر بعد کے نسخوں میں سن وفات درج ہو گیا۔

صاحبِ خزینۃ الاصفیا نے نفحات الانس (اور اخبار الاصفیا) کے حوالے سے باقول معتبر سن وفات ۴۶۵ھ بھی لکھا ہے۔ نفحات الانس جامی کے تمام نسخوں میں حضرت مخدوم کا سالِ وفات درج نہیں ہے۔ سفینۃ الاولیا کا جو نسخہ مولانا دریابادی کے زیرمطالعہ ہے۔ اس میں سن وفات ۴۵۶ یا ۴۶۴ دیا گیا ہے۔ نکلسن ۴۶۵ھ اور ۴۶۹ کے درمیانی عرصہ میں کہیں سنِ وفات تبلاتا ہے۔

حضرت مخدوم کی لوحِ مزار پر کتبہ درج ذیل ہے:

خانقاہِ علی ہجویری است
خاک جاروب از درش بردار
طوطیا کن بدیدہ حق بیں
تا شوی واقفِ درِ اسرار
چوں کہ سردارِ ملکِ معنی بود
سالِ وصلش بر آید از سردار ۴۶۵ھ [1]

مولانا دریابادی لکھتے ہیں:

مزار پر جو قطعۂ تاریخ کندہ ہے اس سے ۴۶۵ھ نکلتا ہے راقم سطور کے نزدیک اسی کو ترجیح ہے۔[2]

اکثر اہل قلم نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ علامہ سید عبدالحئی حسنی لکھتے ہیں:

شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ماہ ربیع الاول ۴۶۵ھ میں لاہور میں ہوا اور یہیں آسودۂ لحد ہوئے۔[3]

میاں طفیل محمد نے بھی ۴۶۵ھ سال وفات مانا ہے۔ شیخ محمد اکرام حضرت مخدوم کا سالِ ولادت ۱۰۰۹ء مطابق ۳۹۹ اور سن وفات ۱۰۷۲ء لکھتے ہیں۔

...... آپ کی وفات ۴۶۵ھ یعنی ۱۰۷۲ء کے قریب ہوئی۔[4]

استاد نفیسی اس سن وفات کو مانتے ہیں۔

---

[1] خزینۃ الاصفیاج ۲ ص ۲۳۴ [2] تصوف اسلام ص ۲۴
[3] نزہت الخواطر ج ۱ ص ۱۵۲ [4] آبِ کوثر ص ۸۶

در ۴۶۵ھ مطابق ۱۰۷۲ میلادی در لاہور درگزشت و مزار او ہنوز
بنام داتا گنج بخش لاہوری زیارت گاہ خاص و عام است[1]

حکیم سید امین الدین احمد چند اہل تاریخ و تذکرہ کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے حضرت مخدوم کے سنِ وفات میں اختلاف کیا ہے۔ حکیم صاحب ۴۶۵ھ مانتے ہیں اور ساتھ ہی حضرت مخدوم کی عمر کا اندازہ بھی دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

اور ۹ محرم ۴۶۵ھ کو ۹۲ سال کی عمر پاکر یہ سرتاج خیل الاصفیا اور میر کاروان اولیا راہگذار عالم عقبیٰ ہُوا[2]

حضرت مخدوم کی تاریخ وفات ۲۰ ربیع الاول ۴۶۴ھ بھی بتلائی گئی ہے۔ آپ کی علمی اور دینی حیثیت کے پیشِ نظر آپ کی تاریخ وفات کو یقینی ہونا چاہیے تھا اور ایسا ہی تھا۔ پھر فاضل ژوکوفسکی نے مشہور و راجح قول میں شک کا اظہار کیا۔ اس نے لکھا:

در تحریر شرح حال وے بہ کشف المحجوب بسیار کم توجہ کردہ اند۔

جناب ایم۔ اے مجید یزدانی اس اشارہ کی تشریح کرتے ہُوئے رقم طراز ہیں:

کشف المحجوب میں بعض شخصیتوں کا ذکر کرتے ہُوئے علی ہجویری نے بعض جگہ ان کا صرف نام لکھا ہے اور بعض جگہ ان کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ یا علیہ رحمت یا رضی اللہ عنہ کا اضافہ کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وُہ لوگ مصنّف کی زندگی میں ہی وفات پا گئے تھے۔[3]

---

[1] مجلہ ہلال ج ۴ شمارہ ۱ مئی ۱۹۵۶ء
[2] تذکرہ حضرت علی ہجویری ص ۹۴
[3] ص ۱۴۱ گنج بخش بحیثیت عالم

پروفیسر علم الدین سالک نے بھی اس انداز میں تحریر فرمایا تھا:

کشف المحجوب میں بہت سے ایسے بزرگوں کا ذکر ہے جن سے حضرت مخدوم داتا گنج بخش فیض یاب ہو چکے تھے۔ مگر تصنیف کے وقت وُہ بزرگ رحلت فرما چکے تھے۔ چنانچہ ان کے لیے آپ نے ماضی بعید کا صیغہ استعمال کیا ہے۔

جناب علم الدین سالک کے اس بیان کی روشنی میں کتابچہ 'مرکز تجلیات' کے مولف نتیجہ نکالتے ہیں:

اگر داتا گنج بخش کا یہ سال وفات یعنی ۴۶۵ھ مان لیا جائے تو آپ کی زندگی کی اکثر کڑیاں باہم مربوط نہیں رہتی ہیں[۱]

جناب عبدالحئی حبیبی نے اپنے مقالہ بہ عنوان "تاریخ وفات داتا گنج بخش علی ہجویری غزنوی[۲]" میں اس مسئلہ کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے جس پر بحث کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ تحقیقات کا خلاصہ پیش کر دیا جائے۔

جناب عبدالحئی حبیبی نے حضرت مخدوم کی تاریخ وفات کا مشہور و مرجع سن ۴۶۵ھ کا ذکر کیا ہے، یہی سن آپ کے مزار شریف پر درج ہے۔ صاحبِ مقالہ اس کا قوی امکان سمجھتے ہیں کہ ۱۲۷۸ھ میں حاجی نور محمد فقیر نے تعمیر گنبد کے وقت یہ تاریخ لکھوا دی ہوگی۔ موجودہ کتبہ اسی زمانہ کا ہے یا اس سے کچھ پہلے کا ہوگا۔

اس بنا پر تاریخ مندرجہ کی صحت پر پوری طرح اعتبار کرنے میں

---

[۱] ص ۴۵

[۲] اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۶۰ء جلد ۳۶، عدد ۲، عدد مسلسل ۱۴۰، ص ۲۷ تا ۴۱

نامل ہوتا ہے[1]

جناب عبدالحئی حبیبی شہزادہ داراشکوہ کے حوالے سے حضرت مخدوم کی تاریخ وفات ۴۵۶ یا ۴۶۴ھ اور حاجی خلیفہ کی کتاب کشف الظنون اور سامی بیگ کے قاموس الاعلام کے مطابق ۴۵۶ھ کا ذکر کرتے ہیں۔ غلام سرور لاہوری نے خزینۃ الاصفیا میں ۴۶۵ھ لکھا ہے اور قطعہ تاریخ کہہ دیا ہے اور حوالہ صاحب خزینۃ الاصفیا نفحات الانس اور اخبار الاصفیا کا دیتے ہیں۔ نفحات الانس کے کسی مطبوعہ نسخہ میں سنِ وفات مذکور نہیں تقریباً ہمعصر قلمی نسخہ جناب ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم کے کتاب خانہ میں موجود ہے، جس میں سنِ وفات درج نہیں ہے[2]

آئین اکبری میں سنِ وفات موجود نہیں ہے۔

ثمرات القدس میں جو زمانہ اکبر بادشاہ کے قریب ترکی تاریخ ہے، حضرت مخدوم کا سن وفات ۴۵۶ھ ہے۔ داراشکوہ کا ماخذ یہی کتاب ہو سکتی ہے[3]

ہدایت حسین، ریو، رحمان علی، ملک الشعراء بہار، عبدالماجد، اسماعیل پاشا بغدادی، سید صباح الدین، شیخ محمد اکرام اور علامہ سید عبدالحئی حسنی نے تاریخ وفات ۴۶۵ھ مانی ہے۔ ڈاکٹر قاسم غنی ۴۷۰ھ کے قریب لکھتے ہیں جسے جناب عبدالحئی حبیبی مشکوک ٹھہراتے ہیں۔ نکلسن نے قیاساً ۴۶۵ و ۴۶۹ دیا ہے[4]۔ حبیبی صاحب لکھتے ہیں:

اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے جس کے متعلق قدیم تاریخی شہادت بھی مفقود ہے۔ بہتر ہوگا کہ ہم قدیم کتابوں اور کشف المحجوب کے متن کی

---

[1] ص ۲۸ ایضاً　　[2] ایضاً

[3] ص ۲۹ ایضاً　　[4] ایضاً

جانب رجوع کریں اور دیکھیں کہ ان کے مطالعہ سے منطقی بحث کے ذریعہ ہم ہجویری رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ زندگی کو کہاں تک پہنچا سکتے ہیں اور موصوف کے سال وفات کا کس حد تک اندازہ کر سکتے ہیں[۱]

فاضل مقالہ نگار نے کشف المحجوب سے عبارت نقل کی ہے جس میں دوسرے عارفوں کی طرح ابوسعید فضل الدین محمد المیہنی نے بھی غنا کو فقر سے افضل تبلایا ہے ثقہ مورخین کے حوالے سے شیخ ابوسعید (ابوالخیر) کی تاریخ وفات ۴ شعبان ۴۴۰ھ ہے۔

اس لیے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کشف المحجوب کی تحریر کا زمانہ لازمی طور پر ابوسعید ابوالخیر کی وفات یعنی ۴۴۰ھ کے بعد کا تھا، کیونکہ ہجویری نے وضاحت سے شیخ ابوالخیر کو مرحوم سمجھ کر کشف المحجوب کے لکھتے وقت دعائے خیر بھی کی ہے[۲]

حضرت مخدوم نے ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ گرگانی کے لیے دوبارہ دعا کی ہے۔ ایک بار لکھا ہے "متعنا اللہ والمسلمین ببقائہ" اور دوسری بار ابقاء اللہ تعالیٰ، کشف المحجوب کے لکھتے وقت شیخ ابوالقاسم گرگانی حیات تھے آپ کا انتقال ۴۵۰ھ میں ہوا۔ حضرت مخدوم سے آپ کی ملاقات طوس میں ہوئی تھی اور آپ ابوسعید ابوالخیر کے ہم عصر تھے۔ جناب عبدالحئی حبیبی لکھتے ہیں:

---

[۱] ایضاً ص ۳۰ [۲] ایضاً ص ۳۰-۳۱

[۳] ایضاً ص ۳۱

مندرجہ بالا دونوں اموراور گرگانی موصوف کی درازئ عمر کے بارے میں دعاؤں کے بیان سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ہجویری ۵۰ھ کے بعد لاہور میں مسکون تھے اور کشف المحجوب کی تصنیف میں مشغول تھے۔[1]

فاضل مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ حضرت مخدوم اپنے پیر روشن ضمیر کی وفات کے وقت بیت الجن میں ان کے پاس تھے۔ کشف المحجوب اور نفحات الانس میں شیخ الختلی کا سن وفات نہیں دیا گیا۔ خزینۃ الاصفیا کے مصنف نے ایک نسخہ نفحات الانس کے حاشیہ پر تاریخ وفات ۴۵۳ھ پائی مگر علّامہ ذہبی نے تاریخ وفات ۴۶۰ھ بتلائی ہے۔

واضح ہوتا ہے کہ ہجویری ۴۶۰ھ میں بیت الجن دمشق میں تھے اور اس کے بعد لاہور تشریف فرما ہوئے۔[2]

جناب عبدالحیٔ حبیبی کا مطلب یہ ہے کہ لاہور میں سن ۴۶۰ھ کے بعد کشف المحجوب تکمیل کی منزلوں سے گزری۔

حضرت مخدوم نے استاد ابو القاسم قشیری کا ذکر کئی جگہ فرمایا ہے اور ارشادات گرامی نقل فرمائے ہیں۔

کتاب مذکور میں متعدد مقامات پر جملہ دعائیہ رحمۃ اللہ علیہ جو برگزیدہ مرحوم شخصوں کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے قشیری کے نام کے ساتھ بار بار آیا ہے۔[3]

---

[1] ایضاً ص ۳۱ [2] ایضاً ص ۳۲ [3] ایضاً ص ۳۳

پھر ان کا ذکر بصیغہ ماضی کیا گیا ہے[1]

حضرت ابوالقاسم قشیری کا سنِ وفات ۴۶۵ھ ہے[2] آپ نیشاپور میں استاد ابو علی دقاق کے پہلو میں دفن ہوئے۔ لاہور آپ کی خبر کئی برسوں بعد ہی ملی ہوگی۔

پس ظاہر ہے کہ کشف المحجوب ۴۶۵ھ کے کافی مدت کے بعد ختم ہوئی۔ (ص ۴۴)[3]

حضرت مخدوم نے کشف المحجوب میں حضرت ابوالحسن سالبہ اور آپ کے فرزند گرامی شیخ ابوالفتح کا ذکر فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوالحسن سالبہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کا ذکر بصیغہ ماضی کیا گیا ہے۔ شیخ ابوالفتح زندہ موجود تھے[4] حضرت ابوالحسن سالبہ نے ۴۷۳ھ میں وفات پائی۔

پس اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ کشف المحجوب ۴۷۳ھ کے بعد ختم ہوئی اور ہجویری اس کے بعد بھی زندہ تھے[5]

حضرت مخدوم نے ابو علی فارمدی کے نام کے ساتھ "ابقاہ اللہ" کا دعائیہ جملہ بڑھایا ہے۔ حضرت ابو علی فارمدی کی تاریخ وفات ۴۷۷ھ ہے۔ آپ نے ۷۰ سال کی عمر پائی۔

---

[1] استاد امام زین الاسلام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری رضی اللہ عنہ اندر زمانہ خود بدیع بود و قدرش رفیع و منزلتش بزرگ۔ [2] ایضاً بحوالہ نفحات الانس [3] ایضاً بحوالہ ابن جوزی

[4] شیخ الشیوخ ابوالحسن سالبہ افصح اللسان بود و شیخ ابوالفتح سالبہ مرید را خلقی نیکو و امیدوار است

[5] ایضاً ص ۳۵

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شیخ ہجویری ۴۷۰ھ کے بعد بھی زندہ رہے اور آپ نے کشف المحجوب کی تکمیل ۴۷۰ھ کے بعد کی ہے[۱]

شیخ صعلوکی کا ذکر بھی حضرت مخدوم کشف المحجوب میں کرتے ہیں[۲]۔ علامہ ذہبی شیخ صعلوکی کی تاریخ وفات ۴۷۰ھ بتلاتے ہیں۔ ان کے ذکر بصیغہ ماضی بعید سے واضح ہے کہ حضرت مخدوم ۴۷۰ھ کے بعد حیات تھے[۳]۔ حضرت مخدوم نے ایک اور استاد مکرم امام اوحد ابوالعباس احمد بن محمد الاشقانی کا ذکر کیا ہے[۴]۔ علامہ ذہبی نے ان کی تاریخ وفات ۴۷۹ھ لکھی ہے بصیغہ ماضی ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مخدوم ۴۷۹ھ کے بعد زندہ تھے۔

ایک نہایت قوی دلیل جو ہجویری کا ۴۸۱ھ کے بعد بھی زندہ رہنا ثابت کرتی ہے یہ ہے کہ کشف المحجوب میں ہرات کے ایک بڑے مشہور و معروف صوفی اور عارف شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری کا ذکر بھی آیا ہے اور جملہ مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ کی وفات بمقام ہرات ۴۸۱ ہجری میں واقع ہوئی[۵]

حضرت عبداللہ انصاری کے نام نامی کے ساتھ کشف المحجوب کے سبھی

۱؎ ایضاً ص ۳۵

۲؎ امام آں دیار بود و وی راخلق نیکو بود۔

۳؎ ص ۳۶

۴؎ مرا باوے انسی عظیم بود و یرا بر من شفقتی صادق و اندر بعض علوم استاد من بود۔

۵؎ ص ۲۶

نسخوں میں دعائیہ الفاظ رحمۃ اللہ علیہ لکھے گئے ہیں۔

چونکہ رحمۃ اللہ علیہ اور رضی اللہ عنہ کے کلمات خاص طور پر متوفی لوگوں کیلیے ہی استعمال ہوتے ہیں۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں جب ابھی کشف المحجوب کی تحریر کا پہلا مرحلہ تھا حضرات کے پیر موصوف شیخ الاسلام انتقال فرما چکے تھے۔ لازمی طور پر وہ زمانہ ۴۸۱ ہجری کے بعد کا زمانہ تھا[1]

کشف المحجوب میں طبقات الصوفیہ (امالی خواجہ عبداللہ انصاری) سے کچھ اخذ نہیں کیا گیا۔ کتاب طبقات الصوفیہ آپ کے مرید نے مرتب کی۔ تاریخ ۴۸۱ھ سے ۵۰۰ھ تک بتلائی جاتی ہے[2]

اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کتابیں طبقات اور کشف المحجوب ایک ہی زمانہ میں تحت تحریر و تالیف تھیں اور یہی سبب ہے کہ طبقات ہجویری تک نہیں پہنچی تاکہ اس سے کسی طرح کا استفادہ یا اقتباس کیا جا سکتا[3]

فاضل مقالہ نگار اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کشف المحجوب کی تالیف کا زمانہ ۴۸۱ھ سے ۵۰۰ھ تک ہو سکتا ہے۔

حضرت مخدوم نے کشف المحجوب میں حضرت شیخ قسورہ گردیزی کا ذکر بھی کیا ہے[4] جناب عبدالحئی حبیبی لکھتے ہیں کہ شیخ قسورہ شاہ علی قسور ہیں جو شاہ یوسف گردیزی کے جد مکرم تھے۔

---

[1] ص ۳۷، [2] جناب عبدالحئی حبیبی کی رائے ہے کہ آپ نے خواجہ عبداللہ کا قول دوسری کتاب سے لیا ہوگا یا پھر سنا ہوگا۔ [3] ص ۳۷، [4] و شیخ اوحد قسورہ بن محمد الجردیزی با اہل طریقت شفیقی تمام دارد و ہر یک را بنزدیک وی حرمتی ہست و مشائخ را دیدہ است۔

ان کا مزار بمقام گردیز کابل کے جنوبی صوبہ پکتیا میں ہے۔ آپ سن ۵۰۴ھ میں شیخ الاسلام کے مرتبہ پر فائز تھے۔ فخر مدبر نے کتاب آداب الحرب و الشجاعۃ میں ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب ۶۱۰ھ (اندازاً) میں لکھی گئی تھی۔ اس میں شیخ قسورہ کے مزار پر سے ہونے والی کرامت کا ذکر ہے۔ جس کا تعلق اس زمانہ سے ہے جب علاء الدین جہاں سوز نے غزنی کو جلا ڈالا تھا اور شاہ بہرام غزنوی ہندوستان بھاگ آیا تھا۔

بہرام شاہ غزنوی کا زمانہ ۵۱۱ سے ۵۴۷ھ ہے۔ شہر غزنی کی تباہی ۵۴۵ھ میں ہوئی۔[1]

ان امور سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شیخ الاسلام قسور گردیزی ۵۰۰ ہجری کے آغاز میں وفات پا چکے تھے۔

اس لیے کشف المحجوب کے مکمل ہونے کا زمانہ بھی ۵۰۰ھ کے بعد کا تعین نہیں کیا جا سکتا بلکہ پانچویں صدی ہجری کے آخر زمانہ میں ہونا چاہیے۔[2]

جناب عبدالحئی حبیبی حضرت مخدوم کو حسین زنجانی کا ہم عصر اور جانشین مانتے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیا سے روایت بزبان امیر حسن علاء سجزی نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں؛

یہ روایت جس کی قدامت سات صدیوں سے کم نہیں اور جو فوائد الفواد میں شیخ نظام الدین اولیاؒ سے بہ سند صحیح اور ثقہ چلی آ رہی ہے، غالباً درست ہے۔[3]

اس کے درست ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت مخدوم کے ذکر میں مفتی غلام سرور

---

[1] ص ۳۹ [2] ایضاً ص ۳۹ [3] ایضاً ص ۴۰

لاہوری اسی قول کو نقل کرتے ہیں اور پھر شیخ حسین زنجانی کے ذکر میں ان کی تاریخ وفات باقوال صحیح ۶۰۰ھ لکھتے ہیں[1]۔ مادۂ تاریخ "عارف حسین زنجانی" سے بحساب ابجد ۶۰۰ برآمد ہوتے ہیں[2]۔ مگر دونوں بیانات میں تضاد موجود ہے۔

بہر حال مفتی لاہوری کے اس سہو کی بنا پر ہم نظام الدین اولیاء کے اس پرانے قول کی کسی صورت میں تردید نہیں کر سکتے جب تک اس کے مقابلہ میں کوئی دوسری قدیم تر اور معتبر سند موجود نہ ہو[3]۔

ساری بحث کو سمیٹتے ہوئے جناب عبدالحئی حبیبی لکھتے ہیں ؛

آخر میں نتیجہ مختصر طور پر عرض ہے کہ علی ہجویری غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے لازمی طور پر ۴۸۱ ہجری اور ۵۰۰ ہجری کے درمیان وفات پائی ہو گی۔[4]

جناب عبدالحئی حبیبی نے مسئلہ کا اس قدر تفصیلی مطالعہ فرمایا ہے کہ اب روسی فاضل ژوکوفسکی کی شکایت بے جا معلوم ہوتی ہے کہ حضرت مخدوم کی شرح حال میں کشف المحجوب کی طرف کم رجوع کیا گیا ہے۔ حضرت مخدوم کے سوانح نگار دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ پرانے انداز میں لکھنے والے مختلف تذکروں پر انحصار کر کے حضرت مخدوم کی تاریخ وفات ۴۶۵ھ مانتے ہیں۔ مآثر لاہور میں محمد دین فوق لکھتے ہیں :

حضرت علی ہجویری کی وفات ۴۶۵ھ میں ہوئی۔ اس وقت سلطان ابراہیم افغانستان اور پنجاب کا بادشاہ تھا۔

---

[1] ایضاً ص ۱۴۱ [2] ایضاً ص ۱۴۱ [3] ایضاً ص ۱۴۱

[4] ایضاً ص ۱۴۳

پروفیسر محمد شجاع اور محمد وارث کامل بھی حضرت مخدوم کی تاریخ وفات ۴۶۵ھ مانتے ہیں۔ کتاب بزرگان لاہور میں پیر غلام دستگیر رقم طراز ہیں :

باقوال معتبر آپ کا سال وفات ۴۶۵ھ ہے اور مزار کی چار دیواری کے اندر بھی اندرونی دروازہ پر قطعہ تاریخ کہ جس کا حاصل ۴۶۵ھ ہے، تحریر ہے۔[1]

نئے تنقیدی انداز میں سوانحی خاکہ مرتب کرنے والوں نے جناب عبدالحئی حبیبی کے نتائج سے اتفاق کیا ہے۔ شیخ عبدالرشید لکھتے ہیں :

ان دلائل کی بنیاد کشف المحجوب ہے۔ اس داخلی شہادت کی بنیاد پر یعنی ان ہمعصر اشخاص کی تاریخہائے وفات کا مقابلہ کر کے جو حضرت علی ہجویری کے خاص دوست تھے مصنف حسب ذیل نتائج پر پہنچتے ہیں :

۱۔ کشف المحجوب کی تالیف ۴۸۱ھ اور ۵۰۰ھ کے درمیان ہوئی۔

لہٰذا : ۲۔ حضرت کی تاریخ وفات کا تعین بھی ۴۸۱ھ اور ۵۰۰ھ کے درمیان ہونا چاہئے۔[2]

جناب ڈاکٹر ظہور الدین احمد بھی لکھتے ہیں :

مزار پر کتبہ کی رو سے تاریخ وفات ۴۶۵ھ ہے اور اکثر تذکروں میں یہی سال وفات لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ کشف المحجوب میں خود سید ہجویری نے ابوالقاسم قشیری متوفی ۴۶۵ھ ابوالحسن سالبہ

---

[1] ص ۱۸۷ [2] حیات و تعلیمات حضرت داتا گنج بخش ص ۲۶/۲۷

متوفی ۴۷۱ھ ، ابو علی فارمدی متوفی ۴۷۷ھ اور شیخ عبداللہ ہروی
متوفی ۴۸۱ھ کا ذکر کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ کتاب کی تالیف
کے وقت یقیناً زندہ تھے[1]

حاشیہ پر جناب عبدالحئی حبیبی کے مقالہ کا حوالہ دیا گیا۔

غور کرنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ کشف المحجوب ۴۸۱ھ کے بعد
مکمل ہوئی آپ اس کے بعد بھی زندہ رہے[2]۔

حضرت مخدوم کا زمانہ وفات ۴۸۵ھ سے ۵۰۰ھ کے درمیان تعین کر کے فرماتے ہیں:

اور زیادہ اغلب یہی ہے کہ آپ ۵۰۰ ہجری کے آغاز میں فوت
ہوئے ہوں۔

جناب عبدالحئی حبیبی کے دلائل کی تین بنیادیں ہیں:

۱۔ کشف المحجوب میں بعض اولیائے کرام کا ذکر بصیغہ ماضی کیا گیا ہے۔
۲۔ حضرت مخدوم نے بعض کے جینے کی دعائیں فرمائی ہیں۔
۳۔ بعض کے حق میں دعائے خیر و مغفرت کی ہے۔

بصیغہ ماضی اس شخص کا ذکر کرتے ہیں جو ہمارے درمیان موجود نہ ہو۔ یہ درست ہے مگر یہ قاعدہ ٹوٹ بھی جاتا ہے۔ عام بول چال میں سن ۱۹۷۰ء میں زید اپنے استاد سے متعلق جس سے اس نے ۱۹۵۰ء میں پڑھا، کہہ سکتا ہے عمر میرا استاد ہے۔

جینے کی دعائیں اس کا ثبوت ہیں کہ شخص مذکور تالیف کشف المحجوب کے وقت زندہ تھے مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ ابوالقاسم بن علی عبداللہ گرگانی کی وفات سن ۴۵۰ھ

---

[1] پاکستان میں فارسی ادب ص ۱۲۴

[2] آفتاب ہجویر ص ۸۹

کے بعد تک آپ لاہور میں مسکون تھے کیونکہ آپ نے ان کی درازیِ عمر کی دعا کی ہے۔

سوال رہ جاتا ہے کہ حضرت مخدوم نے بزرگوں کے اسمائے گرامی کے ساتھ رضی اللہ عنہ، رحمۃ اللہ علیہ، علیہ الرحمۃ، رحمۃ اللہ وغیرہ دعائیہ کلمات جو عام طور پر مرحومین کے لیے استعمال ہوتے ہیں، لکھتے ہیں۔ لیکن یہ لازمی نہیں کیونکہ حضرت مخدوم نے خود اپنی ذات کے لیے بھی انہی کلمات کا استعمال ہے:

من بعدہٗ قال الشیخ ابو الحسن علی بن عثمان بن ابی علی الجلابی ثم الھجویری رضی اللہ عنہ۔

وقال المسئول وھو علی ابن عثمان الجلابی رحمۃ اللہ علیہ۔

من کہ علی بن عثمان الجلابی ام رضی اللہ تعالیٰ عنہ می گویم۔

حضرت مخدوم ہی نے صرف اپنی ذات کے لیے ان کلمات کا استعمال نہیں کیا ہے متقدمین میں سے اکثر ایسا کرتے رہے ہیں۔

اس طریق انشا کا کچھ اندازہ نکلسن کو شاید تھا کہ اس نے رضی اللہ عنہ اور رحمۃ اللہ وغیرہ کی اہمیت سے اس سلسلہ میں انکار کیا ہے[1]

نکلسن تاہم ۴۶۵ھ کو سنِ وفات ماننے کے بجائے اس کا تعین ۴۶۵ھ اور ۴۶۹ھ کے درمیانی عرصہ میں کرتا ہے۔

حضرت مخدوم فرماتے ہیں کہ بعض بزرگ جن کا ذکر میں کروں گا انتقال فرما چکے ہیں بعض زندہ ہیں۔ ان دس صوفیوں میں سے جن کا ذکر آیا ہے صرف ابوالقاسم گرگانی کا ذکر ایسے الفاظ میں کرتے ہیں جن میں کسی

---

[1] ص ۱۱ پیش لفظ ترجمہ انگریزی کشف المحجوب

شبہ کی گنجائش نہیں کہ کتاب کی تالیف کے وقت آپ زندہ تھے۔[۱]

پروفیسر نکلسن سفینۃ الاولیاء کے مطابق ابوالقاسم گرگانی کی تاریخ وفات ۴۵۰ ھ اور اپنے نسخہ شجرۃ الذہب کے مطابق ۴۶۹ مان کر آخری سن کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور اسی لیے حضرت مخدوم کے سن انتقال کی آخری حد ۴۶۹ھ مانتے ہیں۔ اس کے باوصف سوال باقی رہتا ہے کہ ابوالقاسم گرگانی نے ۴۶۹ھ میں انتقال فرمایا تو کس دلیل کے ساتھ مان لیا جائے کہ حضرت مخدوم بھی اس سن تک ضرور انتقال فرما چکے تھے۔ ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ ۴۶۹ھ کے بعد بھی بقید حیات ہوں۔

آئیے اب سنِ وفات کے سلسلے میں دوسرے انداز سے غور کریں۔ حکیم سید امین الدین احمد کے مطابق ۴۶۵ھ میں حضرت مخدوم کی عمر شریف ۹۲ سال تھی۔ ۴۸۱ھ میں ۱۰۸ سال ہوئی اور سن ۵۰۰ھ میں ۱۲۷ سال کی۔ شیخ محمد اکرام کا اندازہ مانیں تو حضرت مخدوم کی عمر سن ۴۶۵ھ میں ۶۳ سال تھی۔ سن ۵۰۰ھ میں آپ کی عمر ۱۰۰ سال اٹھتی ہے کسی قابل اعتبار ذریعہ سے معلوم نہیں ہوتا کہ حضرت مخدوم نے سَو سوا سَو سال کی طویل عمر پائی۔ تذکرہ نگار جو غیر معمولی بات کو اٹھاتے ہیں اس ضمن میں خاموش ہیں۔ معمولی تلاش کے ساتھ ان اولیائے کرام کی فہرست مرتب کی جا سکتی ہے جنہوں نے بڑی عمریں پائیں اور جن کا ذکر بھی اہتمام کے ساتھ کیا گیا ہے۔

یہاں اس مسئلہ کے تقریباً سبھی پہلو واضح کر دیئے گئے ہیں۔ جناب عبدالحئی حبیبی اور ان کے ہم نواؤں کی رائے بھی مستحکم نہیں ہے اس لیے فی الحال ہمیں تاریخ و تذکرہ میں متواتر مذکور سن وفات کو مان لینا چاہیے۔ جناب ایم۔ اے مجید یزدانی

---

[۱] ص ۱۰ پیش لفظ انگریزی ترجمہ کشف المحجوب

لکھتے ہیں:[1]

ہمارے نزدیک علی ہجویری کا سالِ وفات ۴۶۵ھ ہی ہے اور تاویلوں سے کھینچ تان کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور پھر ایک آدھ سال کا تقدم و تواخر تو سمجھ میں بھی آسکتا ہے لیکن تیس پینتیس سال کا فرق قابل تسلیم نہیں۔

چند قطعہ تاریخ ملاحظہ فرمائیں:

شیخ عالی علی ہجویری
پیر اعلیٰ محب عالی قدر
ارتحالش مہ ہدایت خواں
نیز فرما محب عالی قدر

خانقاہ علی ہجویری است
خاک جاروب از درش بردار
طوطیا کن بدیدہ حق بیں
تا شوی واقف در اسرار
چونکہ سردار ملک معنی بود
سال وصلش بر آید از سردار

---

[1] گنج بخش بحیثیت عالم ص ۲۴

شد ز دُنیا بہ اوج علیین
چُوں عُلوی جہاں علی ولی
گو وصالش امیر دین سلطان
نیز میر جہاں علی ولی
حضرت مخدوم ہجویری ولی
رفت چوں از فرش بر عرش بریں
از دیانت سال ترحیلش بجو
بار دیگر کن رقم عرفان دین

قدر اعلیٰ بخلد عالی یافت
چوں علی پیر متقی محبوب
نیّر دین علی رقم کردم
رحلتش نامور علی محبوب
کشف اجلال و شمس اجلال است
سال ترحیل آں ولی محبوب

مدفن

نفحات الانس میں مولانا عبد الرحمان جامی، حضرت مخدوم کے شہر و جائے مدفن سے متعلق خاموش ہیں۔

آئین اکبری میں ابو الفضل نے حضرت مخدوم کی ابدی آرام گاہ لاہور بتلائی ہے ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم نے میر عبد العزیز زنجانی لاہوری (ہم عصر عرفی شیرازی) کے قصیدے کے دو شعر نقل کیے ہیں جس سے ابو الفضل کی تائید ہوتی ہے کہ آپ نے لاہور میں انتقال فرمایا اور یہیں آسودۂ خاک ہوئے جہاں آپ کے مرقد پر عقیدت مندوں کا ہجوم رہتا ہے[1]

تقریباً سبھی تذکرہ نگار اس پر اتفاق کرتے ہیں صرف صاحب گلزار ابرار کہتے ہیں کہ آپ کی خواب گاہ غزنی ہے[2] حضرت مولوی ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

---

[1] اشعار یہ ہیں:

مزار در نثار شاہ ہجویری نہ دیدستی — کہ محل آسا بہ پیرامونش جوش انس و جاں بینی

گدائی در گہش از منزلت شاہ جہاں یابی — غلام خادمش از رتبہ مخدوم جہاں بینی

[2] اذکار ابرار ترجمہ گلزار ابرار بحوالہ جمالی۔ مقدمہ کشف المحجوب مولوی ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم ص ۸

لیکن اوّلین بیان کہ کشف المحجوب کے مصنف وُہ بزرگ ہیں جن کا مبارک مزار لاہور میں ہے دُوسرے بیان کی نسبت قریب بہ صحبت ہے[1]

علامہ سید عبدالحئی حسنی نے شہر لاہور کے تعین کے باوصف جائے مزار پُر انوار کا تعین نہیں کیا ہے آپ صرف لکھتے ہیں :

شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ماہ ربیع الاوّل ۴۶۵ھ میں لاہور میں ہوا۔[2]

اس ضمن میں مترجم جناب ابویحیٰی امام نوشہروی اضافہ کرتے ہیں :

(مترجم) یہ مرقد شہر لاہور کے قبلہ رُخ ہے اور ان دنوں اس محلّہ کا نام شیخ کے لقب داتا صاحب سے موسوم ہے۔[3]

مقام مدفن کی اس سے سوا درستی کے ساتھ نشان دہی مقدمہ بیان المطلوب اردو ترجمہ کشف المحجوب میں حضرت مولوی فیروز الدین مرحوم کرتے ہیں :

چار سو پینسٹھ ہجری کے صفر کی ۹ تاریخ کو آپ کا وصال ہُوا اور مدوّر حلقہ کے پاس آپ کے جسدِ خاکی کو پیوندِ خاک کیا گیا۔[4]

مقامِ مدفن شہزادہ دارا شکوہ نے یُوں تبلایا ہے۔ قبر درمیان شہر لاہور مغربی قلعہ واقع شدہ، اور حقیقت اس سے مختلف نہیں ہے کہ :

(الف) سلطان ابراہیم بن سلطان مسعود غزنوی کے عہد سے تادمِ تحریر حاکمانِ وقت مزار مبارک پر حاضری دیتے رہے ہیں۔ مسجد و خانقاہ

---

[1] مقدمہ کشف المحجوب فارسی بسعی جناب احمد ربانی ص ۸ - ۹

[2] نزہت الخواطر ج ۱ ص ۱۶۲

[3] ایضاً [4] ص ۱۰ - ۱۱

اور مزار مبارک حضرت مخدوم کی تعمیر و توسیع میں شاہانِ وقت کے علاوہ صاحبانِ توفیق بھی برابر حصہ لیتے رہے ہیں۔

(ب) حضرت مخدوم کے مزار مبارک کے قُرب و جوار میں ان قبروں کے مکینوں سے جن کا تعلق مختلف زمانوں سے ہے تقریباً تسلسل کے ساتھ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ جائے مدفن مشہور و معروف ہی درست ہے۔

(ج) اعتکاف اور چلّہ کشی سے درجات پانے والے بزرگوں میں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اور حضرت فرید الدین مسعود گنج شکر کے اسمائے گرامی لیے جاتے ہیں اور ان مخصوص جگہوں کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔

(د) صاحبان کشف القبور نے اس ضمن میں کوئی مختلف بیان نہیں دیا ہے۔

(س) حضرت مادھو لال حسین قادری کے ذکر میں میرزا محمد اختر دہلوی لکھتے ہیں:

شب کو روضۂ شیخ علی مخدوم گنج بخش ہجویری پر بسر کرتے تھے۔
ایک روز بوقت شب مزار پر وہ تنہا تھے کہ مخدوم پیدا ہوئے اور
مہربانی شیخ کے حال پر فرمائی اسی وقت یہ روشن ضمیر ہو گئے۔[1]

لیکن شہزادہ دارا شکوہ کا فقرہ مولوی ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم کو پسند نہیں آیا۔ آپ نے مقدمہ کشف المحجوب میں لکھا:

یہ کچھ عجیب سا بیان ہے اس لیے کہ قبر شہر کی فصیل سے باہر ہے

---

[1] تذکرہ اولیائے ہند ج ۲ ص ۳۳

البتہ شہر کی بیرونی آبادی کے درمیان ہے اور قلعہ کے مغرب کی
بجائے جنوب مغرب کہنا زیادہ صحیح ہے[۱]

ساتھ ہی شہزادہ داراشکوہ کے دعوٰی اور حضرت مخدوم کے معروف و مشہور جائے مرقد میں مطابقت پیدا کرنے کے لیے جناب مولوی ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم نے تحریر فرمایا:

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ داراشکوہ کے زمانے میں قلعہ سے مغرب کو آتے تھے تو شاہی محل تو اس وقت تھا ہی نہیں پہلا قابلِ ذکر مقام دریائے راوی کا گھاٹ تھا دریا اس وقت قلعہ کے نیچے سے بہتا تھا۔ اس گھاٹ کو کابل جانے والی سڑک عبور کرتی تھی اور گھاٹ کے بعد داتا صاحب کے مزار مبارک والا علاقہ ہی قابلِ ذکر تھا[۲]

مقامات کے تعین میں جناب ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم نے انگریزی سیاح سے مدد لی ہے جو عہد جہانگیری میں لاہور آیا تھا اور جس نے "شکر گنج" کا ذکر کیا ہے جو لاہور کے حوالے سے مسجد گنج بخش ہو سکتی ہے[۳]

مولوی ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کا ذکر عام طور پر تذکروں میں ملتا ہے کہ حضرت مخدوم نے دریائے راوی کے کنارے ایک اونچے مقام پر پرچم اسلام نصب کر دیا اور فرمایا کہ اس کا سایہ لاہور پر ہمیشہ رہے گا[۴]

---

۱ مقدمہ کشف المحجوب فارسی۔ سعی جناب احمد ربانی ص ۶

۲ ایضاً ص ۷

۳ مقدمہ کشف المحجوب فارسی

۴ اشاعتِ ملی نوائے وقت ۱۴ جنوری ۱۹۷۱ء میاں عبدالباری اجمیری

(ان شاء اللہ) ۔ یہ مقام کابل لاہور والی سڑک پر دریا کے اس پار ہو سکتا تھا جہاں حضرت مخدوم کی خانقاہ مزار مبارک اور مسجد ہے[1]۔

اس الجھن کا ایک اور حل بعض اہل رائے نے پیش کیا تھا جو معلوم ہوتا ہے حضرت مولوی ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم کے پیشِ نظر نہیں تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے دیباچہ بیان المطلوب ترجمہ اردو کشف المحجوب میں حضرت مولوی فیروز الدین مرحوم فرماتے ہیں:

بعض اربابِ تحقیق کہتے ہیں کہ علی نام کے دو بزرگ لاہور تشریف لائے تھے ان میں سے ایک قلعہ لاہور کے اندر فصیل کے ساتھ دفن ہوئے جس کا اتہ پتہ اب کچھ نہیں ملتا ہے[2]

قلعہ لاہور میں اس مقام کی نشان دہی کی جاتی ہے —— یہ جائے مدفن صاحب سیرت گنج بخش، غلام جیلانی مخدوم فرماتے ہیں انہوں نے دیکھی ہے[3] حضرت مولوی فیروز الدین مرحوم بیان جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

دوسرے یہی صاحب کشف المحجوب حضرت علی ہجویری ہیں جو بھاٹی دروازے سے باہر آرام فرما رہے ہیں اور جن کے مزار پُر انوار پر جناب سلطان الہند اجمیری اور جناب بابا فرید گنج شکر

---

[1] دارا شکوہ کے اس فقرہ میں جو ابہام ڈاکٹر محمد شفیع صاحب کو طول کلام پر آمادہ کر گیا۔ اس کا سبب حکیم محمد موسیٰ امرت سری صاحب نے کشف المحجوب (نسخہ سمرقند) کے اردو ترجمہ کے تعارف میں درست قیاس کیا ہے کہ لاہور کا نقشہ بدل جانے سے آج وہ تحریر مبہم ہو گئی ہے۔ حکیم صاحب نے اس کا بڑا موزوں ترجمہ کیا ہے کہ ان کی قبر لاہور شہر میں قلعہ سے مغرب کی جانب واقع ہے۔

[2] حاشیہ ص ۱۱

[3] قوسین میں تحریر ہے ؛ (یہ قبر شاہی قلعہ میں میں نے دیکھی ہے)۔ (مرتب)

اکتسابِ فیض کے لیے حاضر ہوئے اور جو اب مرجع خلائق ہے۔[۱]

یہ ممکن ہے کہ ایک نام کے دو بزرگ ہوں۔ مگر اس کا امکان بھی قوی ہے کہ دو جدا اہل اللہ بنا کر صرف اس الجھن کو صاف کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔ قلعہ لاہور والا مقبرہ کسی ایسے بزرگ کا ہو سکتا ہے جس کا نام وقت کی تاریکیوں میں کھو گیا ہے۔ مگر یہ ناقابلِ یقین ہے کہ جن کے علمی اور روحانی فیضان سے نور جان دور دور تک پھیلا، جنہوں نے کئی برس لاہور میں مسندِ ارشاد کو زینت بخشی، جن کے دم وصال بلاشبہ لاتعداد فیوض و برکات یافتہ اشخاص خاص لاہور میں موجود تھے، جن کے مزار مبارک پر سلطان ابراہیم غزنوی، سلطان معز الدولہ غزنوی، خسرو ملک غزنوی، سلطان محمد غوری، سلطان قطب الدین ایبک، سلطان شمس الدین التمش، سلطان غیاث الدین بلبن، خاندان مغلیہ میں اکبر، جہانگیر، شاہجہان، شہزادہ داراشکوہ قادری...... حاضری دینے والوں میں ہوں، جن کی مسجد کی سیڑھیوں کے برابر لاہور کے گورنر کی قبر تا حال موجود ہے..... انہیں لوگ اس حد تک بھول جائیں کہ جائے مدفن سے متعلق ہی بحث کا دروازہ کھل جائے ...... یہ ممکن نہیں ہے۔ حضرت مخدوم کی خواب گاہ شہر غزنی نہیں داتا کی نگری شہر لاہور ہے اور مقامِ مدفن بھی یہی ہے جو مشہور و معروف ہے۔

---

[۱] حاشیہ ص ۱۱۱ یہی الفاظ جناب غلام جیلانی مخدوم نے بلاحوالہ ماخذ درج سیرت فرمائے ہیں۔

تعمیر و توسیع

مسجد و خانقاہ اور مزار مبارک کے سلسلے میں اب ہم تعمیرات و تجاوزات کا ذکر مناسب سمجھتے ہیں، جن سے اس دعویٰ کی تائید ہو گی۔

حضرت مخدوم نے تبلیغی سرگرمیوں کا آغاز قدرتی طور پر اسی جگہ جہاں بیرون لاہور آپ نے قیام فرمایا تھا۔ ایک خانقاہ اور ایک مسجد کی تعمیر سے کیا۔[1] تذکرہ نگاروں نے اسی مسجد کو کعبہ پنجاب و ہندوستان لکھا ہے۔ اس مسجد سے متعلق شہزادہ داراشکوہ لکھتا ہے:

ایک مسجد بھی آپ نے تعمیر کرائی جس کا محراب دوسری مساجد کی نسبت جنوب کو جھکا ہوا تھا۔[2]

علمائے لاہور کا اس پر اعتراض ہوا حضرت مخدوم خاموش رہے اور مسجد کی تکمیل کا انتظار فرمایا۔ پھر مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں:

روزے ہمہ علمائے شہر را جمع نمودہ خود امام شدہ دراں مسجد نماز کرد و بعد از نماز بہ حاضرین وقت فرمود کہ بہ بنیید کہ کعبہ کدام سمت است[3]

---

[1] خزینۃ الاصفیاج ۲ ص ۲۳۳ [2] سفینۃ الاولیا ص ۲۱۰ [3] خزینۃ الاصفیاج ۲ ص ۲۳۳

تمام حجاب اُٹھ گئے اور سبھوں کو کعبہ سامنے نظر آیا[۱]۔ معلوم نہیں جناب غلام جیلانی مخدوم کس وجہ سے اس واقعہ اور اس مسئلہ کو محلِ نظر جانتے ہیں[۲]۔ واقعہ میں کرامت کا رنگ موجود ہے مگر جہاں تک اس مسئلہ کا تعلق ہے حضرت ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم لکھتے ہیں:

ہمارے ایک فاضل معاصر نے اس مسئلہ پر توجہ دی ہے کہ سوائے شاہی مسجد کے دورِ انحطاط کی مساجد کا رُخ صحیح سمت قبلہ کی طرف نہیں ہے[۳]

یہ فاضل معاصر حضرت علامہ عنایت اللہ المشرقی مرحوم ہیں۔

حضرت مخدوم کا مزار پُر انوار اور مرمریں چبوترہ ظہیر الدولہ ابراہیم بن سلطان مسعود غزنوی نے بنوایا[۴]۔ خانقاہ کا فرش اور ڈیوڑھی جلال الدین محمد اکبر بادشاہ نے تعمیر کرائی[۵]۔

۱۲۴۵ھ میں عوض خاں فیل بان مہاراجہ رنجیت سنگھ نے مزار مبارک کے احاطہ کا چبوترہ کھنچوایا۔ مفتی غلام سرور لاہوری لکھتے ہیں:

وسابق بالائے مزار پُر انوار شیخ گنبد نہ بود حالا در سال یک ہزار و دو صد و ہفتاد و ہشت شخصی حاجی نور محمد فقیر بہ تعمیر گنبد معلی پرداخت[۶]

۱؎ ایضاً سفینۃ الاولیا ص ۲۱۰

۲؎ سیرت گنج بخش ص ۳۸

۳؎ مقدمہ کشف المحجوب ص ۶

۴؎ سیرت گنج بخش ص ۴۰ مرکز تجلیات ص ۷۵ بحوالہ تحقیقات چشتی مقدمہ کشف المحجوب

۵؎ ایضاً

۶؎ خزینۃ الاصفیا ج ۲ ص ۲۳۳

مرکز تجلیات کے مرتب تعمیر گنبد کی سعادت ۱۲۷۸ھ میں میر سادھ سے متعلق کرتے ہیں۔[1]

روضہ منوّر سے جانب شمال ایک مدوّر حوض ہے۔ روایت کے مطابق یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت مخدوم قیام لاہور کے بعد تجدید وضو فرماتے تھے۔ مفتی سرور لاہوری لکھتے ہیں:

"تا حال مقام خلوت خواجہ بزرگ اندرون حرم مزار و مکان چلّہ حضرت فریدالدین بیرون خانقاہ عالی جاہ موجود است"[2]

مہارانی چندر کور نے خانقاہ کا مشرقی صحن بنوایا۔[3]

۱۳۴۰ھ میں حاجی غلام رسول نے تعمیر نو اور توسیعِ مسجد کی سعادت پائی۔ حکیم الامت حضرت علّامہ اقبال مرحوم نے "المسجد الاقصی الذی بارکہ" سے سنِ تعمیر نکالا۔ قطعہ تاریخ حسب ذیل ہے:

سال بنائے حرم مومناں
خواہ ز جبریل و ز ہاتف مجو
چشم بہ المسجد الاقصیٰ فگن
الذی بارکہ ہم بگو

گلزار شاہ اور محمد دین صاحب دونوں حضرات نے مسجد کی تعمیر و تجدید میں حصہ لیا۔

۱۳۵۹ھ میں حاجی فیروز الدین مرحوم نے مزار پُر انوار پر چوبی پنجرہ کی بجائے سنگ مرمر

---

[1] مرکز تجلیات ص ۶۲ [2] خزینۃ الاصفیاج ۲ ص ۲۲۳

[3] سیرت گنج بخش ص ۴۵ و مرکز تجلیات ص ۶۲

کی جالیاں اور ستون قائم کرائے۔

دُوسرے والان محمد بخش اور شیخ فیروزالدین کی دختر نیک اختر نے اپنے صرف خاص سے بنوائے[1]۔ بیرونی چار دیواری کے دروازے سید مراتب علی مرحوم اور تیسرا دروازہ چودھری عید محمد نے تعمیر کرائے۔ مزار مبارک کی غلام گردش کے اخراجات امیر النساء نے برداشت کیے[2]۔

خیراتی شفاخانہ ، دارالعلوم ، دارالامان اور محتاج خانہ حال میں مزار پُرانوار سے متعلق کیے گئے ہیں (جب سے اس مرکز تجلیات کی دیکھ بھال کا کام محکمہ اوقاف کے سپرد کیا گیا ہے)

حضرت مخدوم کی مسجد خانقاہ اور مزار پُرانوار کے اردگرد وسیع و عریض قبرستان تھا جسے سکھوں کے عہد میں زمین کے برابر کر دیا گیا۔ جن قبروں کی (کم و بیش) نشان دہی کی جاتی ہے درج ذیل ہیں:

حضرت مخدوم کے پہلو میں ابو سعید ہجویری اور احمد حماد سرخسی آسودۂ خاک ہیں یہ دونوں حضرات آپ کے رفیق کار تھے۔ ابو سعید ہجویری کے سوال کے جوابات میں کشف المحجوب تحریر کی گئی تھی۔ حضرت احمد حماد سرخسی کا ذکر حضرت مخدوم نے کئی بار کیا ہے۔ مولوی ڈاکٹر محمد شفیع مرحوم لکھتے ہیں:

> رجال صوفیہ متاخرین کی فہرست میں ان کو شامل کر کے لکھا ہے کہ وہ مدت تک میرے رفیق رہے[3]۔

---

[1] سیرت گنج بخش ص ۴۴ [2] ایضاً ص ۴۵

[3] مقدمہ کشف المحجوب ص ،

صدر دروازے کے بائیں طرف حضرت مخدوم کے بھتیجے زاد شیخ حضوری کی قبر ہے۔ مزار مبارک کے اوّلین مجاور رائے راجو، عہد اکبری کے مجاور سلیمان کی قبریں بھی قابل ذکر ہیں۔ پنجاب کے گورنر مومن خان کی قبر مسجد کی سیڑھیوں کے قریب تھی اور اب صحن میں آچکی ہے۔

صدر دروازے ہی کے قریب شیخ حضوری کے برابر حاجی غلام رسول کی قبر ہے۔ مدوّر حوض کے برابر مولوی فیروز الدین مرحوم، غلام حیدر سجادہ نشین اور محمد امین سوداگر کی قبریں ہیں۔ احاطہ مزار منوّر میں حضرت مولانا ابو الحسنات مرحوم دفن ہیں۔

تعمیرات و توسیعات اور ان قبور سے جن کا پتہ حضرت مخدوم کے زمانہ سے تسلسل کے ساتھ تا حال ملتا ہے۔ اس امر کی تائید مزید ہوتی ہے کہ حضرت مخدوم کی جائے مدفن مشہور و معروف درست طور پر مرجع خاص و عام ہے۔

تصانیف

مولانا عبدالرحمان جامی لکھتے ہیں:

وصاحب کتاب کشف المحجوب است[1]

شہزادہ داراشکوہ نے ان الفاظ میں کسی قدر اضافہ کیا ہے:

آپ کی تصانیف بے شمار ہیں کشف المحجوب زیادہ مشہور ہے[2]

میکلیگن اور روز بھی اسی قدر اطلاع فراہم کرتے ہیں:

کشف المحجوب آپ کی تصنیف بیان کی جاتی ہے[3]

علامہ سید عبدالحئی حسنی نے نزہت الخواطر میں نفحات الانس کے حوالے سے صرف کشف المحجوب کا ذکر کیا ہے[4]۔ میاں طفیل محمد اردو ترجمہ کشف المحجوب میں مندرجہ ذیل فہرست تصانیف کا نام لیتے ہیں:

۱۔ کشف المحجوب	۲۔ منہاج الدین
۳۔ الرعایۃ الحقوق اللہ	۴۔ کتاب الفنا والبقا
۵۔ اسرار الخرق والمؤنات[5]	۶۔ نحو القلوب

---

[1] نفحات الانس ص ۲۰۲   [2] سفینۃ الاولیا ص ۲۱۰

[3] پنجاب اور سرحدی صوبہ میں قوم قبیلے ص ۵۳۳۔   [4] ج ۱

[5] بعض نے اس کو الملونات لکھا ہے۔

۷۔ کتاب البیان لاہل البیان   ۸۔ دیوان اشعار

اِن آٹھ کتابوں کا ذکر کر کے میاں طفیل محمد لکھتے ہیں:

اب کشف المحجوب کے سوا کوئی اور کتاب نہیں ملتی۔[۱]

حضرت مولانا عبد الماجد دریا بادی فرماتے ہیں:

اس قدر یقینی ہے کہ تصوّف پر متعدد کتابیں تصنیف کیں ان کے نام تک کسی تذکرہ میں محفوظ نہیں ہیں۔[۲]

حضرت مخدوم نے تاہم کشف المحجوب میں جن تصانیف کا ذکر فرمایا ہے ان کی فہرست حضرت مولانا عبد الماجد دریا بادی نے مرتب فرمادی ہے فہرست وہی ہے جو میاں طفیل محمد نے دی ہے۔ پھر حضرت عبد الماجد دریا بادی لکھتے ہیں:

دو کتابوں کے حوالے اور آتے ہیں۔ خدا معلوم ان سے مراد کتب بالا ہی ہیں یا یہ تصانیف ان کے علاوہ ہیں نکلسن کا خیال ہے کہ یہ علیحدہ تصانیف ہیں۔[۳]

اس طرح حضرت مخدوم کی کل تصانیف دس ہوئیں۔ ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم نے مقدمہ کشف المحجوب میں جو فہرست مرتب فرمائی وہ بعینہٖ یہی ہے۔ دس کتابوں کے ناموں کے ساتھ ان کا تعارف کراتے ہوئے نمبر ۵ ۔ ۵ پر آپ لکھتے ہیں:

کتاب در شرح کلام حسین منصور حلّاج، یہ کتاب کا نام نہیں اس کا مضمون ہے۔ اس میں دلیلوں اور حجتوں سے حلاج کے علو کلام

---

[۱] ایضاً   [۲] تصوف اسلام ص ۳۴

[۳] ایضاً ص ۳۵

پر گفتگو کی ہے۔[۱]

کتاب نمبر ۵ سے متعلق لکھتے ہیں:

ایک کتاب ایمان کے موضوع پر لکھی جس کا نام نہیں بتلایا۔[۲]

یہ وہی دو کتابیں ہیں جن کا ذکر نکلسن نے کیا ہے اور جس کے حوالے سے صاحب تصوف اسلام مولانا عبد الماجد دریابادی نے ان کتابوں کو اپنی فہرست تصانیف حضرت مخدوم میں شامل کیا ہے۔ حضرت مولوی محمد شفیع مرحوم نے مقدمہ میں نمبر ۷ پر کتاب کا نام نحو القلوب لکھا ہے جس کا تعارف یوں کرایا ہے:

۷۔ نحو القلوب اس میں جمع و تفرقہ پر سیر حاصل گفتگو ہے۔[۳]

کتاب کا نام نحو القلوب ہے۔ کشف المحجوب میں یہی نام ہے۔ حضرت مخدوم لکھتے ہیں:

اندر نحو القلوب اندر باب جمع فصولے گفتہ ام۔

بحر القلوب حضرت مخدوم کی کسی کتاب کا نام نہیں محض کتابت کی غلطی ہے۔

شیخ محمد اکرام آبِ کوثر میں لکھتے ہیں:

داتا گنج بخش کئی کتابوں کے مصنف تھے مثلاً کشف المحجوب، کشف الاسرار، منہاج الدین البیان لاہل العیان۔[۴]

اس طرح فہرست میں ایک اور کتاب کشف الاسرار کا اضافہ ہوا ہے جس سے

۱؎ ص ۹/۱۰ مقدمہ کشف المحجوب فارسی بسعی و اہتمام جناب احمد ربانی

۲؎ ایضاً ص ۱۰ ۳؎ ایضاً ص ۱۰

۴؎ ص ۸۷

کل تعداد گیارہ ہوگئی ہے۔

حکیم سید امین الدین احمد تذکرہ حضرت علی ہجویری میں لکھتے ہیں:

> کشف المحجوب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے مندرجہ ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں۔

پھر ایک ایک کر کے تعارف کے ساتھ کتابیں گنوائی ہیں۔ کشف المحجوب سمیت کل سات کتابوں کا ذکر حکیم سید امین احمد نے کیا ہے۔ چھ کتابوں کا ذکر مختصر ہے کل چار صفحات میں کشف المحجوب کا تجزیہ اور کتاب پر تبصرہ سولہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ بحر القلوب اور کتاب الفنا و البقا کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ شاید سرسری مطالعہ میں دونوں کتابیں صرف نظر ہو گئیں۔ فہرست میں نمبرہ پر کشف الاسرار کا ذکر ہے۔

> آپ کی پانچویں کشف الاسرار ہے۔ اس چھوٹی اور مختصر کتاب میں تصوف اور معرفت کے حقائق اور انوار بیان کیے گئے ہیں اور طریقت کے اسرار کے حجابات کو آشکارا کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر ظہور الدین احمد لکھتے ہیں:

> سید صاحب کی مندرجہ ذیل تصانیف کا سراغ ان کی اپنی کتاب کشف المحجوب سے لگایا گیا ہے ممکن ہے ان کے علاوہ اور بھی تالیفات ہوں لیکن اس وقت کشف المحجوب اور کشف الاسرار کے سوا باقی تمام مفقود ہیں۔[۱]

ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے حضرت مخدوم کی گیارہ کتابیں گنوائی ہیں۔ فہرست میں

---

[۱] پاکستان میں فارسی ادب ص ۱۲۵

مندرجہ کتابوں کے ناموں میں دو کتابیں شامل ہیں جن کا ذکر نکلسن نے کیا ہے نمبر ۵ پر کتاب درشرحِ کلام حسین بن منصور حلّاج نمبر ۹ پر کتاب الایمان نمبر ۸ پر کشف الاسرار کو رکھا گیا ہے نمبر ۷ پر کتاب کا نام نحو القلوب درج ہے جو درست نہیں۔ کتاب کا نام بحر القلوب ہے۔[1]

مولانا عبدالرحمان جامی کشف المحجوب سے متعلق لکھتے ہیں:

از کتب معتبرہ مشہور دریں فن است ازوی کہ لطائف وحقائق بسیار دراں کتاب جمع کردہ است[2]

سفینۃ الاولیا میں شہزادہ دارا شکوہ نے لکھا ہے:

کسی کو اس کتاب پر کوئی کلام نہیں یہ تصنیف دراصل کامل رہنما ہے۔ کتب تصوف میں ایک مرشد کامل ہے۔ فارسی زبان میں ایسی کامل کتاب تصنیف نہیں ہوئی۔[3]

کشف المحجوب کا ذکر کرتے ہوئے خزینۃ الاصفیا میں مفتی غلام سرور لاہوری نے صرف صاحب سفینۃ الاولیا کے الفاظ دہرا دیئے ہیں مگر یہی رائے (تقریباً) علامہ سید عبدالحئی حسنی کی ہے۔ نزہتہ الخواطر میں وہ لکھتے ہیں:

کشف المحجوب اہل علم اور اصحاب معرفت کے نزدیک معتبر ہے۔[4]

میاں طفیل محمد آغاز سخن ترجمہ اردو میں کشف المحجوب کو علمِ تصوف میں سند کا درجہ دیتے ہیں[5]۔ شیخ محمد اکرام اسے حضرت مخدوم کا شاہکار تبلاتے ہیں اور کتاب کے

---

[1] ایضاً [2] نفحات الانس ص ۲۰۲

[3] سفینۃ الاولیا ص ۲۱۰ [4] ج ۱ ص ۱۵۲ [5] اردو ترجمہ کشف المحجوب

مضامین عالیہ کے متعلق لکھتے ہیں :

پیشتر دنیا اور دنیا داری سے دور رہ کر مرشد کی پیروی کر کے اللہ اللہ کرنے اور دل کو کبر و حرص سے پاک رکھنے کی باتیں ہیں[1]

حکیم سید امین الدین احمد نے کشف المحجوب کو مشہور عالم اور مایہ ناز تصنیف قرار دیا ہے جگہ جگہ اور وقت وقت کے معیار مختلف ہوتے ہیں مگر ہر جگہ اور ہر زمانے میں کشف المحجوب سخت سے سخت معیار پر پوری اتری ہے۔ کتاب سے متعلق حضرت مخدوم کا اپنا معیار یہ ہے :

کتاب ایسی ہونی چاہیے کہ پڑھنے والا مصنف کے حق میں دعائے خیر کرے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ پڑھنے والے کو اس سے کچھ حاصل ہوگا تبھی وہ دعائے خیر کرے گا[2]

کشف المحجوب اس کڑے معیار پر پوری اُترتی ہے۔ جناب ایم۔ اے مجید فرماتے ہیں :

ایک صوفی کو اس سے منزل سلوک کا سراغ مل سکتا ہے۔ ایک عامل اس سے مستفید ہو سکتا ہے اور ایک عالم اس سے اپنے علم و دانش میں بے پناہ اضافہ کر سکتا ہے[3]

حضرت مخدوم نے عالم اسلام کی سیاحت فرمائی تھی ہم عصر (تقریباً) سبھی علما اور صلحا سے استفادہ فرمایا تھا جس سے آپ کی رائے کا صائب ہونا لازمی تھا۔ اسی لیے

---

[1] آب کوثر [2] گنج بخش بحیثیت عالم ص ۱۷

[3] ایضاً ص ۲۲

کشف المحجوب کو علمی و روحانی دنیا میں بڑا بلند مقام دیا جاتا ہے:

اہل علم اور اہل باطن نے اس کتاب کی اہمیت اور فضیلت کو تسلیم کیا ہے[۱]

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت مخدوم نے مجتہدانہ اور ناقدانہ انداز میں اسلام اور تصوف پر بُنے ہوئے سب جالے صاف کرنے کا اہتمام فرمایا ہے۔ اس سلسلہ میں نہ آپ کسی کے ساتھ ہیں نہ کسی کے خلاف حضرت مخدوم صرف حق کے ساتھ ہیں۔

مصنف نے جہاں جاہل صوفیوں کی پھیلائی ہوئی بدعتوں کی نشان دہی کر دی ہے وہاں نام نہاد علماء کی قلعی بھی کھول کر رکھ دی ہے اور اسلام کی سیدھی سادی باتوں کو ان کی اصلی شکل میں پیش کر کے اسے رفاہِ عام کے لیے قلمبند کیا ہے[۲]

کشف المحجوب کو تصوف پر فارسی میں پہلی کتاب مانا جاتا ہے اور یہ درست ہے ابوبکر کلاباذی کی کتاب تعرف، ابونصر سراج کی کتاب اللمع اور حضرت ابوالقاسم قشیری کا رسالہ حضرت مخدوم کی کتابوں سے پہلے کی کتابیں ہیں۔ یہ سب کتابیں عربی میں لکھی گئی تھیں۔ فاضل روسی مستشرق نے لینن گراڈ میں کشف المحجوب کے ایڈیشن میں ان کتابوں کی فہرست مرتب کر دی ہے جو حضرت مخدوم کے پیش نظر تھیں۔ یہ سب کتابیں قدیم مستند کتابوں کا درجہ رکھتی ہیں۔ چند کا ذکر جناب ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے اپنی کتاب 'پاکستان میں فارسی ادب' میں کیا ہے:

---

[۱] پاکستان میں فارسی ادب ص ۱۲۷

[۲] گنج بخش بحیثیت عالم ص ۲۲

۱۔ بیان آداب المریدین (محمد بن علی ترمذی)

۲۔ تاریخ اہل صفہ (عبدالرحمان محمد بن حسین السلمی)

۳۔ تصحیح الدرراوہ (جنید بغدادی)

۴۔ الرعایہ بحقوق اللہ (احمد بن خضرویہ)

۵۔ تاریخ المشائخ (محمد بن علی ترمذی)

۶۔ رسالہ (قشیری ابوالقاسم)

۷۔ کتاب اللمع (ابی نصر سراج)

۸۔ مرآۃ الحکماء (شاہ بن شجاع کرمانی)[1]

ان کتابوں کے علاوہ اور بے شمار کتابیں حضرت مخدوم کے زیر مطالعہ رہی ہوں گی۔ آپ اور دوسرے علماء کے نام گنواتے ہیں اور ان کی تصانیف و خیالات عالی پر مختصر اور جامع تبصرے فرماتے ہیں۔ ان میں ابوعثمان سعید بن اسماعیل الجیری، ابوبکر محمد بن الوراق، عمرو بن عثمان مکی ابوسعید خراز، ابوعلی الحسن بن علی الجرجانی، حسین منصور بن حلاج، ابوالعباس القسم بن مہدی سیاری، ابوجعفر محمد بن المصباح الصیدلانی ابی عبداللہ محمد بن حفیف شامل ہیں۔

ان کاغذی رہنماؤں کے علاوہ مصنف نے وقت کے جید علمائ
اور عرفائے کبار کی خدمت میں حاضر ہو کر اور ان کی صحبتوں سے
فیضیاب ہو کر جن مطالب کا اخذ و ادراک کیا وہ نورٌ علیٰ نور ہے
ان سب باتوں کی آمیزش سے اس کتاب کا خمیر اٹھایا گیا ہے۔[2]

---

[1] پاکستان میں فارسی ادب ص ۱۲۹ [2] ایضاً ص ۱۳۰

حضرت مخدوم نے کشف المحجوب میں عام انداز میں خوشہ چینی نہیں فرمائی آپ نے ہر مسئلہ کا تجزیہ کیا ہے۔ باریک بینی کے ساتھ اس کے تمام پہلو زیر بحث لائے ہیں۔ ہدایتوں کو تسلیم کیا ہے تشریح کی ہے اور بعض باتوں کو مسترد فرمادیا ہے۔ اس طرح کشف المحجوب کی حیثیت ایک 'حَکَم' کی ہے جو بلا رورعایت فیصلہ صادر کرتا جاتا ہے اور جس کے فیصلے میں گہرائی اور گیرائی، خلوص اور دیانت داری صاف نظر آتی ہے۔ کہا گیا ہے:

اگر کسے را پیرے نہ باشد چوں این کتاب را مطالعہ کند او را پیدا شود۔

ہمارے پیش نظر کشف المحجوب کا کتاب خانۂ جناب مولوی محمد شفیع مرحوم کا وہ قدیم نسخہ ہے جسے جناب مولوی محمد شفیع مرحوم کے فرزند گرامی احمد ربانی نے بڑے اہتمام سے شائع کروایا ہے۔ اس کے کل صفحات ۴۸۱ ہیں فی صفحہ ۲۳ سطریں اور فی سطر (اندازاً) ۱۶ لفظ ہیں۔ اس طرح کتاب میں (اندازاً) ایک لاکھ ہزار الفاظ ہیں۔ اس لحاظ سے بھی کشف المحجوب کوئی معمولی کتاب نہیں۔ ایسی مفصل و مدلل کتاب حضرت مخدوم کے جوہر ذاتی علم و فضل پر دلالت کرتی ہے۔ مولانا عبد الماجد دریابادی لکھتے ہیں:

کشف المحجوب کی تصنیف خود اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ اس کا مصنف علوم ظاہری پر وسیع نظر رکھتا ہے۔[1]

کشف المحجوب میں ۲۹ باب ہیں اور بعض موضوع مختلف شاخوں کی مطابقت میں

---

[1] تصوفِ اسلام ص ۳۳

کئی فصلوں پر مشتمل ہیں۔ سارے نسخوں میں ابواب و فصول کی تعداد یکساں معلوم نہیں ہوتی۔ جو نسخہ مولانا عبدالماجد دریابادی اور پروفیسر شیخ عبدالرشید کے زیر مطالعہ ہے اس میں ۲۵۔ ڈاکٹر ظہور الدین احمد کے نسخہ میں ۲۴ باب ہیں۔

ابوسعید ہجویری نے حضرت مخدوم سے تصوف اسلام کے مختلف مباحث سے متعلق استفسار کیا تھا۔

بیان کن مرا اندر تحقیق طریقت تصوّف کیفیت مقامات ایشاں
و میان مذہب و مقامات آں اظہار کن مرا رموز و اشارات ایشاں
چگونگی محبت خدائے عزّ وجلّ و کیفیت اظہار آں بر دلہا و سبب
حجاب عقول از کنہ ماہیت آں و نفرت نفس از حقیقت آں و
آرام روح با صفوات آں آنچہ بدیں تعلق دارد از معاملات آں۔

انہی سوالات کے جوابوں کو حضرت مخدوم نے کتاب میں پھیلا دیا ہے۔ اس ضمن میں حضرت مخدوم نے صرف حکایات و روایات اولیاء اللہ سے غرض نہیں رکھی بلکہ کمال ہنرمندی سے کھرے اور کھوٹے کو الگ کر دیا ہے۔

کشف المحجوب کے مباحث کا خلاصہ مولانا عبدالماجد دریابادی، پروفیسر شیخ عبدالرشید نے حیات و تعلیمات حضرت داتا گنج بخش میں دے دیا ہے۔ حکیم امین الدین احمد نے باب ۱۔۵ تک خلاصہ لکھا ہے پھر مسئلہ سماع (جس پر خود حضرت مخدوم نے بحث کی ہے) بیان کیا ہے ضرورت ہے کہ کشف المحجوب کا مطالعہ توجہ کے ساتھ کیا جائے تاکہ اسلام کی تصویر جو حضرت مخدوم ابھارنا چاہتے ہیں سامنے آجائے۔ اس میں گوناگوں مشکلات کا سامنا پڑتا ہے۔ بعض مسائل باریک ہیں۔

ان کا تو سمجھنا ہی مشکل ہے۔ حضرت مخدوم کا اندازِ بیان، الفاظ کی نئی ترکیبوں کی وجہ سے نیا معلوم ہوتا ہے۔ متروک الفاظ کا استعمال بھی حضرت مخدوم نے فرمایا ہے بعض الفاظ کا املا مختلف ہو گیا ہے۔ کشف المحجوب کے متن کی ان دقتوں کا ذکر ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے پروفیسر ژوکوفسکی کے حوالے سے کیا ہے[1]

کشف المحجوب کی تاریخی ضرورت اور اہمیت سے متعلق کسی تذکرہ سے کچھ پتہ نہیں چلتا۔ البتہ آربری کے انگریزی ترجمہ کتاب التعرف کے دیباچہ سے کلاباذی کی اس کتاب کے علاوہ کتاب اللمع رسالہ قشیریہ، کشف المحجوب، عوارف المعارف سہروردی اور فتوح الغیب کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی پڑتی ہے۔ اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے تصوف کی تاریخ میں ذرا پیچھے جانا پڑے گا۔

> ایک جماعت صوفیا کے ساتھ منصور حلّاج بغداد میں رونق بخش ہوئے اور آپ نے اس موقعہ پر حضرت جنید رحمتہ اللہ علیہ سے ایک مسئلہ دریافت کیا انہوں نے اس مسئلہ کے متعلق جواب نہ دیا اور یہ فرمایا تو لکڑی کا سرا بہت جلد سُرخ کرے گا۔ اس کے معنی یہ ہُوئے کہ تُو سولی چڑھایا جائے گا۔ آپ نے یہ سُن کر کہا جس دن میں سُولی پر چڑھوں گا حضور بھی اہل ظاہر کا لباس زیب تن کریں گے[2]

منصور حلاج نے اہل ظاہر اور اہل باطن کی تفریق کا ذکر کیا ہے جس سے

---

[1] پاکستان میں فارسی ادب ص ۱۳۲ - ۱۳۵

[2] باب اول سوانح عمری منصور ابن حلاج ص ۳ نثار علی

تاریخ اسلام میں دُور رس نتائج برآمد ہوئے۔ حسین بن منصور حلاج، عبداللہ تستری، عمر بن عثمان، حضرت جنید بغدادی سے فیض یافتہ تھے۔ آپ نے خراسان، عراق، حجاز، خوزستان، ماوراءالنہر، تیمروز، سیستان اور کرمان میں اہل اللہ سے ملاقاتیں کی تھیں۔ بعض کہتے ہیں کہ آپ ہندوستان اور ماچین بھی گئے تھے۔

ہر جگہ آپ کی بزرگی اور عبادت دیکھ کر بہت لوگ آپ کے معتقد ہو گئے اور آپ کی خدمت میں مصروف ہوئے۔ اس حالت میں بھی آپ کی آزادی کا یہ حال تھا کہ آپ اہل زمانہ کا پاس لحاظ نہ کرتے تھے۔[1]

آپ کی طبیعت کا یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر حضرت جنید نے آپ کو خلوت اور سکوت کی ہدایت کی جسے آپ نے منظور نہ فرمایا۔

اس لیے لوگوں میں آپ کے اقوال کا شور پڑ گیا تھا۔ سب سے زیادہ بات حیرانی کی یہ تھی کہ آپ حق حق حق، انا الحق کہتے تھے۔ اور یہ ایک بڑا سخت کلمہ ہے کہ انسان بے بنیاں ضعیف کثیف اپنے آپ کو حق کہے لوگوں نے آپ سے کہا ہوالحق کہو۔ آپ نے فرمایا واقعی وہ ہمہ اوست ہے۔ تم کہتے ہو گم ہوا ہے لیکن وُہ گم نہیں ہوا بلکہ منصور ہی گُم ہوا ہے۔ بحرِ محیط بھی کہیں گم ہوتا ہے یا گم ہو سکتا ہے۔[2]

---

[1] ایضاً ص ۴

[2] ایضاً باب سوم حال قتل حسین ابن منصور حلاج ص ۱۸

صاحب کتاب الطواسین حسین منصور ابن حلاج کو حسب فتویٰ ابو عمرو قاضی بہ تصدیق علمأ باب الطلاق بغداد میں سن ۳۱۰ھ مطابق ۹۲۲ میں سُولی دے دیا گیا۔ آربری لکھتا ہے:

تصوّف کے لیے یہ نازک وقت تھا۔ منصور کو پھانسی دیئے جانے کے بعد (جو ابو بکر کلاباذی کے بچپن کا واقعہ ہے) خطرہ تھا کہ تصوف کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیا جائے گا۔[1]

اس خطرہ کا احساس کیا گیا اور اس کو ٹال دینے کی کوششیں ہُوئیں۔ کتاب التعرف (باب ۵ - ۴۰) میں حضرت ابو بکر کلاباذی کو فقہ اکبر کے حوالے سے اسلام اور تصوّف کے اصولوں میں موازنہ اور مقابلہ کرنے کے بعد کوئی فرق نظر نہ آیا ــــ وُہ لکھتے ہیں:

صوفیہ کے یہی اصول ہیں جو صوفیہ کی کتابوں یا ان کے اقوال کا مطالعہ غائر نظر سے کرے گا۔ یقیناً کہے گا ہم نے درست لکھا ہے۔[2]

ابو القاسم قشیری کا رسالہ، ابو طالب مکّی کی قوت القلوب، کتاب اللمع کا مقصد بھی یہی تھا کہ تصوّف اور اسلام میں مطابقت پیدا کی جائے۔ کشف المحجوب فارسی زبان میں پہلی کتاب ہے جس میں تصوّف کی محافظت کے سلسلے میں قلم اٹھایا گیا ہے۔ حضرت سہروردی نے فرمایا ہم کتاب التعرف کے بغیر تصوّف سے آشنا نہیں ہو سکتے۔ یہی دعویٰ فارسی زبان میں کشف المحجوب سے متعلق بھی اعتماد کے ساتھ دُہرایا جا سکتا ہے، موضوع کی رعایت سے آیات و احادیث، اقوال ائمہ اور حکایات اولیاء سے

---

[1] دیباچہ ترجمہ کتاب التعرف ص ۱۴ و پیش لفظ تعرف (اردو ترجمہ) از ڈاکٹر پیر محمد حسن ص ۱۷

[2] ترجمہ انگریزی کتاب التعرف دیباچہ آربری بحوالہ متن کتاب ص ۳، ۴، ۷

استدلال کا مقصد یہی ہے کہ تصوّف کے مسائل کو ہمیں اسلام کے مطابق بیان کر کے تصوّف کو اسلام سے خارج کیے جانے سے متعلق احتجاج کیا جائے۔

نکلسن بھی اس نظریہ سے اتفاق کرتا ہے کہ حضرت مخدوم تصوّف کو طریق اہل سنّت اور اسلام کا ترجمان بنانے کی کوشش کرتے ہیں[1]۔ لیکن آر بری۔ سے بڑھ کر پروفیسر نکلسن کشف المحجوب اور حضرت مخدوم کی اہمیت تصوف کی تاریخ میں کہیں زیادہ دکھلاتے ہیں۔

پیغمبر اسلام سے عقیدت کے باوجود اپنے نظریات میں ہجویری، ابوسعید ابوالخیر اور عبداللہ انصاری (پرانے اور نئے ہم عصروں) سے جدا نہیں ہیں۔ ان تینوں نے فارسی وجد و حال سے خدا تک رسائی کے طریق کو رواج دیا جسے پورے شدومد کے ساتھ فریدالدین عطار اور حضرت جلال الدین رومی میں دیکھا جا سکتا ہے[2]۔

قدیم تذکرہ نگار کشف المحجوب کا ذکر کرتے ہیں۔ حضرت مخدوم کی چند دوسری تصانیف اور دیوان اشعار دوسرے لوگوں نے اپنے نام سے منسوب کر لیا تھا شاید دوسری تصانیف رواج نہ پا سکیں، صرف کشف المحجوب ہی ایسی تصنیف تھی جو دلوں سے محو نہ ہو سکتی تھی۔ استاد نفیسی حضرت مخدوم کے ضمنی حوالے میں لکھتے ہیں:

مؤلف کشف المحجوب مہم ترین کتاب تصوّف فارسی[3]

---

[1] نکلسن سمجھتا ہے کہ وہ ایک نہیں اور ایک نہیں ہو سکتے۔

[2] دیباچہ انگریزی ترجمہ کشف المحجوب ص ۱۳

[3] مجلہ ہلال ج ۴ ش ۱ مئی ۱۹۵۶ء

دراصل کشف المحجوب کے بعد کسی اور کتاب کے رواج پانے کا (خواہ وہ حضرت مخدوم کی تصنیف ہی کیوں نہ ہو) سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے اس زمانے کے حالات کے پیشِ نظر کسی کتاب نسبتاً کم رتبہ کا بچ رہنا معجزہ سے کسی طرح کم نہیں کہا جا سکتا۔ جناب شیخ عبدالرشید حضرت مخدوم کے حالاتِ زندگی کی نایابی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

لاہور بہت سے سیاسی اور فوجی ہنگاموں سے مسلسل دوچار رہا۔
جن میں تمام تحریری یادداشتیں تلف ہوگئی ہوں گی [1]

آپ کی تصانیف بھی کمیاب ہو کر نایاب ہوگئیں۔ ان کے صرف نام رہ گئے۔ فہرست کشف المحجوب کے مطالعہ ہی سے مرتب کی جا سکتی ہے۔ فہرستوں میں کتابوں کے نام کم یا زیادہ ہوگئے ہیں کیونکہ ان کا انحصار ذاتی یادداشت، مطالعہ اور معلومات پر تھا۔ تذکرہ نگار جدید تحقیق کے انداز سے واقف نہیں تھے جہاں کوئی حکم اس وقت تک نہیں لگایا جا سکتا۔ جب تک کوئی امر ذاتی دریافت کا نتیجہ نہ ہو تذکرہ والوں سے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں (مثلاً) سفینۃ الاولیاء کا مصدر نفحات الانس ہے۔ تذکرہ اولیائے ہند میرزا محمد اختر دہلوی خزینۃ الاصفیاء مفتی غلام سرور لاہوری سے اخذ و ترجمہ ہے۔ بہرحال حضرت مخدوم کی کتاب کا نام جہاں کسی تذکرہ نگار یا راوی سے چھوٹ گیا تو بعد میں لکھی جانے والی تحریروں میں برابر چھوٹتا گیا۔ اس کے باوجود حضرت مخدوم کی فہرست تصانیف میں کہیں کہیں کشف الاسرار کا ذکر ملتا ہے جو کشف المحجوب کے بعد دوسری تصنیف باقی رہ گئی ہے۔ دوسری سب کتابیں مفقود ہیں

---

[1] حیات و تعلیمات حضرت داتا گنج بخش ص ۲۱

کشف الاسرار کو بعض تذکرہ نگاروں نے بلا جھجک حضرت مخدوم کی تصنیف مان لیا ہے مگر بعض نے تامل بھی کیا ہے اور اس طرح کتاب کے مستند یا مستند نہ ہونے کی بحث چل نکلی ہے۔ شیخ عبدالرشید لکھتے ہیں:

> تصوف پر ان کی شہرہ آفاق کتاب کشف المحجوب نیز کشف الاسرار جو ایک نامستند تصنیف ہے دو ماخذ ہیں جن سے ان کے حالات و خیالات کا پتہ چلتا ہے۔[1]

باب سوم میں پروفیسر شیخ عبدالرشید نکلسن کی مرتبہ فہرست تصانیف بحوالہ کشف المحجوب کا ذکر کرتے ہیں اور کل چھ کتابوں کے نام گنانے کے بعد لکھتے ہیں:

> آجکل مذکورہ بالا تصانیف میں سے کوئی بھی دستیاب نہیں۔ کشف الاسرار مختصر سا رسالہ ہے جو ان سے منسوب ہے لاہور میں طبع ہوا ہے۔ ظن غالب یہ ہے کہ یہ معرفت آموز تالیف کسی ایسے شخص کی ہے جسے حضرت ہجویری کی تعلیمات کو مقبول بنانے کی دھن تھی۔[2]

نکلسن نے فہرست تصانیف کشف المحجوب کی مدد سے مرتب کی ہے اور کشف الاسرار اس میں شامل ہے۔ معلوم نہیں کن وجوہات کی بنا پر پروفیسر شیخ عبدالرشید اس معرفت آموز تالیف کو کسی دوسرے شخص سے منسوب کر سکتے ہیں۔ حضرت مخدوم کی تصانیف کے ضمن میں جناب ڈاکٹر ظہور الدین احمد کشف المحجوب اور کشف الاسرار کے

---

[1] ایضاً ص ۲۱

[2] ایضاً ص ۳۱

سوا حضرت مخدوم کی جملہ تصانیف کو مفقود بتلاتے ہیں۔ لیکن کشف الاسرار سے ڈاکٹر صاحب نے جدا باب میں بحث فرمائی ہے جو چھ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے[1]۔ حضرت مخدوم نے جگہ جگہ کشف المحجوب کی طرح اپنا نام لیا ہے۔ زندگی کے حالات تبلائے ہیں جن کی تاریخی سند موجود ہے۔ استادوں کا ذکر کیا ہے۔ لاہور میں تدریسی مصروفیات بتلائی ہیں اور معاصر اہل اللہ کا ذکر کر کے ان کے اقوال نقل کیے ہیں[2]۔

مذکورہ بالا باتیں ایسی ہیں جن سے یہی خیال ہوتا ہے کہ یہ رسالہ
سیدؒ علی ہجویری کا ہی لکھا ہوا ہے مگر زبان و بیان کی خامیاں
اور تاریخی غلطیاں ہمیں مجبور کرتی ہیں کہ ہم اس رسالہ کو داتا صاحب
کی تالیف نہ سمجھیں[3]۔

زبان و بیان کی خامیوں اور تاریخی غلطیوں کی نشان دہی ڈاکٹر ظہور الدین احمد بقید صفحات کرتے ہیں۔ ان کے پیش نظر کشف الاسرار اور اس کا اردو ترجمہ بنام بحر الاسرار ہے[4]۔

کشف الاسرار کے ص ۱۲ کے حوالے سے ڈاکٹر ظہور الدین احمد

کشف المحجوب را بجہت قلبی در اندک مدت تمام کردہ بودم۔

پر اعتراض کرتے ہیں کہ کشف المحجوب تھوڑے عرصہ میں مکمل ہونے والی کتاب نہیں۔

یہ بیان خلاف واقعہ ہے سید صاحب نے کشف المحجوب میں
خود بیان کیا ہے کہ وہ دو مرتبہ ہندوستان آئے پہلی مرتبہ کی
آمد کا ذکر انہوں نے اس طرح کیا ہے۔ من اندر دیارِ ہند میان

---

[1] پاکستان میں فارسی ادب
[2] ایضاً
[3] ایضاً ص ۱۵۵
[4] ایضاً ص ۱۵۵ - ۱۵۹

ناجنساں گرفتار ماندہ (ص ۱۰۰ نسخہ مطبوعہ لینن گراڈ)۔ اس
سلسلے میں انہوں نے ذکر کیا ہے کہ ان کی کتابیں غزنی میں رہ
گئی ہیں۔ اس لیے وہ اپنے شیخ کی بعض روایات نقل نہیں کر سکتے
یہ پہلا سفر ۴۲۹ / ۴۳۰ھ میں ہوا۔ کشف المحجوب ۴۸۱ھ تک مکمل
نہیں ہوئی تھی کیونکہ انہوں نے عبداللہ ہروی متوفی ۴۸۱ھ کو
رحمۃ اللہ علیہ لکھا ہے اس سے ظاہر ہے کتاب کئی سالوں میں مکمل
ہوئی ویسے بھی کشف المحجوب کی ترتیب و تبویب اور تنوع موضوعات
کے لیے بے شمار کتابوں کے حوالے اس بات کی تصدیق کرتے
ہیں کہ درمیان اندک مدت یہ کتاب مکمل نہیں ہو سکتی۔[1]

حضرت مخدوم کے ورود لاہور کی تاریخ درست ہی ہے۔ تذکرہ نگار ۴۳۱ھ
بتلاتے ہیں آپ کے مرشد کا انتقال ۴۶۰ھ میں ہوا۔ آپ ان کے پاس تھے تو
لاہور سے آپ عارضی طور پر ملک شام آئے ہوں گے بہر حال دوسرے سفر کی
معتبر شہادت موجود نہیں ہے۔ اگر ۴۸۰ھ میں بھی کشف المحجوب مکمل نہیں ہوئی تھی
تو خود ڈاکٹر ظہور الدین احمد کے اندازے کے مطابق اس میں پچاس سال لگ گئے
ہوں گے۔ حضرت مخدوم کے لیے بہت بڑا عرصہ کہا جا سکتا ہے۔ عالم اسلام میں
علما اور صلحا سے استفادہ فرمانے کے بعد غزنی میں کتاب خانہ رہ جانے کے سبب
دقت حضرت مخدوم کو ضرور ہوتی ہوگی۔ مگر یہ سمجھنا غلط معلوم ہوتا ہے کہ آپ کتابوں کے
بغیر کام جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ بے شمار کتابوں کے حوالے اقوال، قرآنی اور

---

[1] پاکستان میں فارسی ادب

تفسیری اشارے ، احادیث نبوی ، حکایات ، فلسفہ و منطق کی بحثیں ، ماورائی مسائل سبھی کشف المحجوب میں موجود ہیں۔ ہر معاملہ میں ظاہر بظاہر ذہن سے مدد لی گئی معلوم ہوتی ہے۔ ہر بات کے لیے کتاب کھول کر صفحہ، سطر و لفظ کی نشان دہی نہیں کی گئی ہے نہ کشف المحجوب سادہ خشک تحقیقی مقالہ ہے۔ یہ دعویٰ کہ کشف المحجوب ۴۸۱ھ وفات حضرت عبداللہ ہروی کے بعد تک تکمیل کی منزلوں سے گزر رہی تھی، غلط ہے۔ حضرت مخدوم کے پایہ کے عالم کے لیے جن کا ذہن علوم ظاہری و باطنی کے خزائن سے کم نہیں تھا۔ کشف المحجوب صرف ساڑھے چار سو صفحات کی کتاب کے لیے بہر حال چند مہینے سے زیادہ عرصہ درکار نہیں ہو سکتا۔ کتاب کشف المحجوب حضرت مخدوم کے بیان کے مطابق حضرت ابو سعید ہجویری کے سوالات کا مکمل اور مدلل جواب تھی۔ اب یہ نہیں مانا جا سکتا کہ سائل موصوف نے جواب باصواب پانے کے لیے تقریباً نصف صدی انتظار کی زحمت فرمائی۔

کشف الاسرار پر بھی ڈاکٹر ظہور الدین احمد کی تنقید درست معلوم نہیں ہوتی۔ رسالہ ہذا کے ص ۱۶۰ کے حوالے سے ڈاکٹر صاحب کو منصب ہفت ہزاروی پر اعتراض ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ مناصب کا اجرا اکبر بادشاہ کے عہد میں ہُوا۔ یہ بھی غلط فہمی ہے مناصب تو امیر تیمور صاحب قران کے زمانہ میں بھی موجود تھے۔ کشف الاسرار کے ص ۱۹ پر لکھا ہے:

اے علی ترا خلق گوید گنج بخش

ڈاکٹر صاحب کا اعتراض یہ ہے کہ گنج بخش کا لقب خواجہ معین الدین چشتی کے ایک شعر کی وجہ سے مشہور ہُوا۔ اس سلسلہ میں اپنی بحث کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ

یہ بھی غلط ہے۔ آپ کا لقب گنج بخش زندگی ہی میں مشہور ہو گیا تھا۔

کشف الاسرار کے ص ۷ پر لکھا ہے:

میدانی کہ سلامت خواہم ماند زن مکن کہ بلائے است عظیم و
عذابے است الیم۔

ڈاکٹر ظہور الدین احمد کا اعتراض یہ ہے کہ حضرت مخدوم نے ایک کی بجائے دو شادیاں کیں۔ حضرت مخدوم نے کشف المحجوب میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس سے جو نتیجہ نکالتے ہیں حسب ذیل ہے:

ممکن ہے اس رسالے کے مولف نے ان سے ہم نوائی اور
ہم فکری کی خاطر ان کا یہ خیال لکھ دیا ہو۔

مطلب ڈاکٹر صاحب کا یہ ہے کہ حضرت مخدوم خود شادیاں کر کے دوسروں کے لیے زن مکن کی ہدایات جاری نہیں کر سکتے تھے۔ حضرت مخدوم کے سلسلے میں تاہم اس دعوٰی کا واضح ثبوت کوئی نہیں ہے کہ آپ نے شادیاں کی تھیں۔ کشف الاسرار کے ان الفاظ کو بھی تاریخی غلطی نہیں مانا جا سکتا۔

ڈاکٹر صاحب کی کشف الاسرار میں تاریخی غلطیوں کے ضمن میں ان کی بحث سے ہم نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ کشف الاسرار کے بیانات کو صرف جھٹلانے پر مائل ہیں۔ انہوں نے ہر دعوٰی کے ثبوت میں جن دلیلوں کا سہارا لیا ہے وُہ قطعی نہیں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب وقتی طور پر ایسا نکتہ نظر اختیار کر لیتے ہیں۔ کشف المحجوب میں عورت اور شادی سے متعلق حضرت مخدوم کے بیانات پر جو ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے

کشف الاسرار کی بحث میں اس سے بالکل الٹ نہیں ہونی چاہیے۔

ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے زبان و بیان میں غلطیوں کی فہرست مرتب کی ہے "سخنان بسیار برائے طالبان خود دارم" یا "اے علی تو یوسف کنعانی" میں انہیں بوئے غرور آتی ہے جو حضرت مخدوم کو زیب نہیں دیتی۔ "مشائخان" جمع غلط ہے۔ "در نظر من این بہ از دیگر اذکار ست" میں زبان ناہموار ہے زبان کی اور نیرنگیاں بھی ایک ایک کر کے گنوائی گئی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو شکایت ہے کہ رسالہ کی فارسی "دیسی" ہے۔ مطالب میں تضاد موجود ہے ایک جگہ لکھا ہے "طالب عقبی مشو"۔ دوسری جگہ "خدام اجنّت دہ" دیوان کے گم ہو جانے کی شکایت کر کے حضرت مخدوم اپنی غزل نقل فرماتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں :

> آپ بھی ملاحظہ کر لیں زبان کس قدر غلط ہے بندش الفاظ کتنی ڈھیلی اور تخیّل کتنی غیر واضح ہے[1]

زبان و بیان کی جن ناپختگیوں کی طرف ڈاکٹر صاحب نے اور حال ہی میں حکیم محمد موسیٰ صاحب نے اشارہ کیا ہے وہ کاتبوں کی نوازشیں بھی ہو سکتی ہیں اور محض اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انکار کی راہ اختیار کرنا یک طرفہ فیصلہ سنا دینا ہے ہم زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ کشف الاسرار میں الحاقات کی بھرمار ہے لیکن اگر آپ اسے ان کی تصنیف ماننے سے ہی انکار کر دیں تو اس کتابچہ کے متعلق مزید "پُن چھان" کی راہیں بند ہو جائیں گی اور امکان موجود ہے کہ کبھی کسی گوشے سے کوئی قدیم قلمی نسخہ نکل مشکل آسان کر جائے۔ یہی بات اشعار کی ہے۔ حضرت مخدوم کے مشن کے

---

[1] پاکستان میں فارسی ادب ص ۱۵۸

پیشِ نظر ان کی شاعری میں (جناب ڈاکٹر ظہور الدین احمد کے مطابق) چست بندشیں، تخیّل کی پرواز، زبان کی خوبیاں اور نزاکتیں دریافت ہونے کی توقع درست نہیں ہے۔ اسی لیے شیخ محمد اکرام حضرت مخدوم کی شاعری پر رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

ان کا دیوان ان کی زندگی میں کسی نے چرا لیا تھا۔ ان کی نثر کی تصانیف میں ان کے جو اشعار ملتے ہیں وہ بہت سادہ اور فنّی خوبیوں سے معرّا ہیں[1]

لیکن وہ انکار کی راہ اختیار نہیں کرتے۔

---

[1] ارمغانِ پاک مقدمہ ص ہ

اردو ترجمہ

رسالہ

کشف الاسرار

تعریف اس بے نیاز خدا کی جس نے ہمیں عناصر اربعہ سے بنایا اور نعت پیغمبرؐ کی کہ ہم حضورؐ کے اُمتی ہیں۔

عرض کرتا ہوں کہ یہ کتاب مختصر ہے۔ بڑی کتاب سے آدمی اُکتا جاتا ہے۔ قاری اس رسالہ میں نامناسب بات دیکھے تو اصلاح کرے اور لطف و کرم سے درگزر کرے۔

میں علی بن عثمان جلابی اپنے دوستوں کے لیے بہت سی مفید باتیں جانتا ہوں جن پر عمل کرنے سے وہ مشائخ کے پیشوا ہو سکتے ہیں۔

کتاب کشف المحجوب کو میں نے دلی محبت کے ساتھ جلد ہی ختم کر لیا تھا باقی باتیں میں اس مجموعہ کشف الاسرار میں لکھتا ہوں۔ یہ کتاب دوسرے اذکار سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ تعریف سے جو تم کرتے ہو ارفع و اعلیٰ ہے۔

فقیر بادشاہوں اور حاکموں کی دوستی اور ہم نشینی کو سانپ اور اژدہا کی دوستی جانے۔ فقیر کو بادشاہ کا قرب میسر آتا ہے تو اس کا توشہ برباد ہو جاتا ہے۔

اور چونکہ لباس پر بہت سی باتیں ہو سکتی ہیں اس لیے اس کا ذکر کشف المحجوب میں کیا گیا ہے۔ یہاں اسی قدر کہنا ہے کہ چار گوشہ ٹوپی سر پر رکھ کر کوئی فقیر نہیں بن جاتا ہے ٹوپی چاہے کافروں کی سر پر رکھ مگر سچا فقیر بن اور راضی برضا ہو۔ فقیر دولت مند کی ہم نشینی

کے لیے فقیری لباس پہنے تو اسے آتش پرست، مغرور اور متکبر جانو۔

چونکہ اسباب کے سلسلہ میں فقیر کے لیے مرشد کی حضوری سے بہتر کوئی چیز نہیں۔ اس لیے مرشد کی جدائی کو یاد رکھ، فقیر کو بے وطنی اور مفلسی فقیر بناتی ہے۔ سنا ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم ایک روز فقر کی بات کر رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ فقیروں کو معرفت کیونکر میسر آتی ہے۔ اصحابؓ نے عرض کیا یا حضرتؐ! خدا بہتر جانتا ہے۔ اسی اثناء میں حضرت جبرئیل علیہ السّلام وحی لائے (ترجمہ) روئے زمین پر سیر و سیاحت کر کے دیکھو کہ جھٹلانے والے کا انجام کیا ہُوا ہے —— اس لیے اے ہجویری سفر بڑی دولت ہے، اسے اختیار کر۔ ابھی چل، دلیلوں اور حجتوں کو چھوڑ۔ سامان سفر ہو تو حج کے لیے جا۔ محنت اور مشقت اٹھا تاکہ معرفت کے میدان میں آجائے...... مجھ ہجویری الغزنوی نے اسی دن سے سیر و سیاحت اختیار کی ہے اور عجائبات مخلوق ملاحظہ کیے ہیں۔

حاصل کلام یہ کہ ماوراءالنہر میں ایک روز میں ایک حوض کے کنارے بیٹھا تھا۔ جب میں نے ہاتھ پانی میں ڈالا تو مجھے اپنا محبوب منظور نظر دکھائی دیا۔ اسی دن سے مجھے معلوم ہوا کہ دِل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔

(اس لیے) محبوب کو اختیار کر اور پھر اس پر جان نثار کر اور یہ سمجھ کہ اس کی راہ میں جان قربان ہو جائے تو بہتر ہے۔ اگر دیکھنا ہی ہے تو خدا کی صنعت دیکھ۔ اپنی شمع کا پروانہ بن اور پرواہ نہ کر کہ جان پر بن جائے گی تو بہتر رہے گا۔ غرور کو تن سے نکال دے۔

اور میں جب ہندوستان آیا تو لاہور کے نواح کو جنت مثال پایا۔ میں نے ڈیرہ ڈال دیا اور لڑکوں کو پڑھانے کے وسیلے سے سکونت پذیر ہو گیا۔ جب مجھے خُوب

معلوم ہو گیا کہ یوں تو حکومت کی بُو میرے دماغ میں آگئی ہے میں نے اسے ترک کر دیا اور پھر اس کا نام نہ لیا۔

اے طالب! اپنے حبیب لبیب کا غم پیدا کر، راہ خدا کا مردِ راہ بن۔ رات عبادت میں بسر کر۔ حواس کو کھول۔ زیادہ رو اور کم ہنس۔ خدائے تعالیٰ نے فرمایا چاہیے کم ہنسیں اور بہت روئیں ...... صبح کے وقت دریا پر جا۔ حضرت خضر علیہ السلام سے محبت کر اور اسم مذکور کا ذکر کر تاکہ منزلِ مقصد پر پہنچے —— لازم ہے کہ تو خواہشات نفس کی طرف میل نہ رکھے۔ لوگوں سے ملنا جلنا ترک کرے، تنہائی اختیار کرے اور جو نذر نذرانہ ملے درویشوں میں تقسیم کر دے اور اپنے پاس کچھ نہ رکھے۔ خدا کے سوا کسی سے لَو نہ لگائے کسی قبر پر گزر ہو تو پڑھ کر اسے بخشے تاکہ وہ بھی تیرے حق میں دُعا کرے۔ اگر کھجور کی گُٹھلی بھی کسی کی تیرے ذمہ ہے تو اسے ادا کر دے اپنے پاس کچھ نہ رکھ —— جب تجھے دوست کے راز کی خبر ہو جائے اور وُہ تیرے دل میں بیٹھ جائے تو اسے سنبھال کر رکھ اور الٹ نہ دے اور اس سے بری نہ ہو جا۔ اسی میں تیرا بھلا ہے۔ منصور حلاج کو دیکھا کہ اس نے دوست کے راز کا ایک شمہ ظاہر کیا تو سر سے گزر گیا اور اس کی معرفت خاک میں مل گئی۔

بلاشبہ حضرت خضر علیہ السلام اولیاء اللہ کے دوست ہیں اور یہ بھی درست ہے کہ اولیاء اللہ کو لقا اور مشاہدہ ربانی ہوتا ہے۔ رشتہ داروں سے نیک سلوک تجھ پر لازم ہے۔ ماں باپ کو اپنا قبلہ و کعبہ سمجھ۔ تفاسیر میں آیا ہے اور حضرت حسام الدین لاہوری سے میں نے سنا ہے کہ اگر آدمی والدین کی قبر پر سجدہ کرے تو کفر لازم نہیں آتا۔ کوئی مشکل درپیش ہو تو والدین کی قبر پر جا کر دعا کر، اس سے مشکل حل ہو جائے گی۔

حسام الدین لاہوری کہتے ہیں کہ نفس کافر ہے جس پر فتح خدا کی امداد ، خاموشی ، بھوک پیاس ، تنہائی، میل جول ترک کرنے ، اکیلے رہنے اور ہر دم خدا کی یاد کے ذریعہ ممکن ہے۔

میں حسام الدین لاہوری کے سرہانے وقتِ نزع موجود تھا کہا اے جانِ من! میرے لیے دعا کر کہ خاتمہ بالخیر ایمان پر ہو۔ مجھے یاد ہے کہ جان کنی کے وقت کان ان کے ہونٹوں کے قریب لایا تو سنا کہ کہہ رہے تھے اے اللہ! تو میرا پروردگار ہے اور میں تیرا بندہ —— وُہ اسّی سالہ نیک آدمی تھا۔

میں نے وقت اخیر حسام الدین لاہوری سے وصیت چاہی کہا اے ہجویری! آدمیوں کی ہر آن دلجوئی کر نیکی کر وہی کر جس سے کوئی تجھ سے خوش ہو۔ کسی کا دل نہ دُکھا خدا کے سوا کسی کو دوست نہ رکھ۔ انہوں نے یہ بھی کہا علم ضائع نہ کر۔ مال و دولت اور اولاد کو فتنہ سمجھ۔ دیکھ اب میری جان نکل رہی ہے اولاد میرے کام نہیں آرہی۔ میرا عمل میرے ساتھ ہے اور ساتھ رہے گا۔ تجھے لازم ہے نیک رہے اور ماں باپ کی دلجوئی کرے۔

میں نے تاج الدین کو کہتے سُنا کہ بھونرا پھول کے گرد خوشبو میں مست پھرا کرتا تھا۔ اسے اس مٹی پر جہاں چنبیلی اُگی ہوئی تھی تڑپتا ہُوا دیکھا پوچھا چنبیلی کیا ہُوئی کہا سنا ہے جل گئی ہے۔ اسے کہا گیا کہ اے کچے کیا عشق اسی کا نام ہے کہ تو اس کے بعد زندہ رہا اور اس کے ساتھ ہی نہ جل مرا۔ بولا یار وہیں پردیس گیا تھا۔ میری عدم موجودگی میں چنبیلی برباد ہوئی۔ میں چاہتا ہُوں کہ اس کی جگہ نظر آجائے مگر مجھے دکھائی نہیں دیتی۔ ناچار جس جگہ وُہ اُگی تھی اور جہاں اس کے نشان ہیں میں اس کی مٹی تاج سمجھ کر سر پر ڈالتا ہُوں۔

اس لیے اے دوست تجھے ہی چاہیے تو سچا عاشق ہو جائے اور اپنے پیر و مرشد کے قدموں میں جان دے دے مرشد کے قریب رہے اس کا دیدار کرتا رہے تاکہ حقیقت اور طریقت تک رسائی ہو (اِن شاءَ اللہ ——— خدا کو سب سے بہتر خبر ہے)

اب یہ بات ختم ہوئی تو دوسری شروع کرتا ہوں۔ توجہ سے سُنو، یہ باتیں کام آئیں گی۔ اگر تو ہفت ہزاری بھی ہو جائے تو کیا آخر ایک مشتِ خاک ہے اور خاک بھی ہوتا ہے۔ ایک قطرہ ہے پھر اتنا غرور کس لیے۔ جو بالآخر دنیا سے تجھے جو کچھ ملتا ہے وہ چار گز کفن ہے۔ اور خدا جانے وہ بھی ملے یا نہ ملے۔

اے غافل دیکھ، یہ مَیں اور خودی چھوڑ دے۔ مرد راہ بن اور دوسرے کا حق نہ مار۔ دولتِ دنیا کو عذاب سمجھ اور اسے غریبوں میں لٹا دے۔ اگر نہ لٹایا تو قبر میں کیڑے بن کر تجھے کھائے گی اور لٹا دیا تو تیری دوست بن جائے گی۔ تیرے ہاتھ پاؤں تیرے دشمن ہیں۔ جب مر جائے گا تو پاؤں، آنکھیں، ہاتھ گواہی دیں گے کہ بُری جگہ گئے تھے، بُری نگاہ ڈالی تھی، دوسرے کی چیز اٹھائی تھی۔ پس کسی کی چیز کی خواہش نہ کر۔ گناہوں پر دن رات توبہ کر۔ استاد کے حق کا خیال رکھ۔ مخلوقِ خدا پر رحم کر۔ لقمہ حرام مت کھا۔ بے عزتی کی جگہ قدم نہ رکھ اور عزت کرنے والے کے پاس بیٹھ۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ دس چیزیں دس چیزوں کو کھا جاتی ہیں:

توبہ گناہ کو۔ جھوٹ رزق کو۔ چغلی، عمل کو۔ غم، عمر کو۔ صدقہ، بلا کو۔ غصہ، عقل کو۔ پشیمانی، سخاوت کو۔ تکبر، علم کو۔ نیکی، بدی کو۔ ظلم، عدل کو ——— یہ باتیں دوستوں کو بتاتا ہوں تاکہ ان پر عمل کریں اور میرے حق میں دعائے خیر کریں۔ مجھے یاد رکھیں، خدا کو پہچانیں اور غیر پر نگاہ نہ کریں۔

طالبِ حق کے لیے ضروری ہے کہ غرور، تکبّر، خود پسندی سے پرہیز کرے۔ شہر سے باہر رہے اور اسماء جن کا ذکر کروں گا اور جن کی تعریف نہیں ہو سکتی، کو اپنا وِردِ وظیفہ بنائے۔

لقمان حکیم سے منقول ہے کہ میں نے چار سو پیغمبروں کی خدمت کی اور اُن سے آٹھ ہزار باتیں سیکھیں جن میں سے آٹھ انتخاب کیں جن سے خدا شناسی حاصل ہوتی ہے جو یہ ہیں:

۱۔ نماز میں دل کا قابو میں رکھنا

۲۔ جماعت کا ساتھ دینا

۳۔ غیر کے گھر میں آنکھ کو محفوظ رکھنا

۴۔ لوگوں میں زبان کو محفوظ رکھنا

۵۔ خدائے بزرگ و برتر کو بھول نہ جانا

۶۔ موت کو یاد رکھنا

۷۔ نیکی کر کے نہ جتلانا

۸۔ دوسروں کی بُرائی بھول جانا

عزیزو! ان باتوں کو یاد رکھو۔ ان پر عمل کرو۔ یہ باتیں میں نے والد بزرگوار قدس سرہٗ سے سُنی تھیں۔

میں ہجویر میں پیدا ہُوا۔ خدا اسے حادثوں اور مصیبتوں سے محفوظ رکھے اور ظالم بادشاہ سے بچائے۔ میں نے وہاں وُہ باتیں دیکھیں کہ لکھوں تو قلم سیاہ آنسُو روئے اور عاجز رہے۔ وہیں شیخ بزرگ نامی ایک عمر رسیدہ شخص رہتے تھے انہوں نے فرمایا: اے علی! تُو ایک کتاب لکھ جو تیری یادگار رہے۔ میں نے کہا حضور مجھے تو ابھی علم کا کچھ اتہ پتہ

ہی نہیں ہے، میری عمر اس وقت بارہ سال کی تھی۔ جب انہوں نے اصرار کیا تو میں نے اسی عمر میں ہجویر کے اندر کتاب لکھ دی اور ان کے سامنے پیش کی۔ انہوں نے فرمایا ایک دن تم بزرگ ہو گے۔ میں نے کہا حضور آپ کی نوازش۔ مجھے ان کی نصیحتیں یاد ہیں۔ کہا تجھے چاہیے کہ معشوق سے محبّت کرے۔ میں نے پوچھا معشوق کون ہے؟ فرمایا خدا۔ وہ اس پر مہربانی فرماتا ہے۔ مجاز اختیار کر۔ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: مجاز، حقیقت کے لیے پُل ہے —— فقیروں سے محبّت کر۔

شیخ ابوالقاسم میرے استاد نے مجھے تعلیم دی۔ فرمایا: فقیر کے لیے مرشد کی حضوری سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ مرشد غوّاص ہوتا ہے نہ کہ گمراہ۔ فقیر کی بساط ہو تو بیعت کرے، بن بساط کے ہر دو خراب ہوں گے۔ فقر کی راہ بڑی دشوار ہوتی ہے۔ اے عزیز! میں نے دل میں ٹھانی ہے کہ سفر میں رہوں تاکہ دل زنگ آلُود نہ ہو جائے اور صیقل ہوتا رہے۔ لوہے کو زنگ لگ جاتا ہے تو صیقل سے دُور ہوتا ہے۔

اے میرے محبوب! خدا سے دُعا کر —— یا اللہ! میرے دل کو روشن چراغ بنا۔ اپنی یاد کا شوق بخش، دل کو غیر سے خالی کر، پیر مرشد کو مجھ پر مہربان کر۔ پہلے میرے دل کو شکر بخش، پھر مجھے دولت دے۔ پہلے دل کو کدورت سے پاک کر، پھر اپنے راز سے نواز۔ پہلے صبر دے اور پھر بیماری۔ یا اللہ مجھے وُہ دے جو بہتر ہے، پسندیدہ کی توفیق دے۔

مبتدی کے لیے مناسب یہی ہے کہ سماع کے پاس نہ پھٹکے بلکہ الگ رہے۔ یہ راستہ بہت کٹھن اور محال ہے۔ اس میں خرابی کا اندیشہ ہے۔ گوشہ گیری اختیار کرے۔ محبتِ مرشد خدا سے طلب کرے اور اس کے سامنے مجنوں کی طرح رہے۔ سوائے

محبوب کے کسی اور کی بات سُننا جہالت ہے اور سچّا عاشق بنے۔

مجھے ایک دوست کی بات یاد آتی ہے کہتا تھا: اے دوست خدا کی عنایت ہو تو جنگل جا کر خدا کی عبادت کروں اور کسی سے سوائے خدا کے نہ مانگوں۔ اور میں (علی بن عثمان جلابی) اس کو دوست رکھتا ہُوں جو قریب رہ کر دوست رہے، برائیوں سے بچے تاکہ بامراد ٹھہرے۔

خدائے تعالیٰ حکیم علیم عزیز شفیق ہے۔ اس کا لُطف عام ہے وُہ کریم ہے رحیم ہے رحمان، غفّار، جبّار، قہّار، وہّاب، سلطان، منّان ہے۔ اللہ گنہگاروں کا فریادرس ہے۔ میری دُعا ہے کہ میری زبان شہادت کے وقت نہ رُکے اور مجھے آٹھ جنتیں عطا کر اور میرا معشوق میرے پہلو میں ہو۔ مجھے عذاب میں گرفتار نہ کر۔ میں بیمار بے حال ہوں تُو شافی کافی ہے میرے واسطے۔

میں چاہتا ہی ہوں کہ گوشہ گیر رہوں اور محبوب کے چہرے کے سوائے کسی پر نظر نہ ڈالوں۔

اے علی! لوگ تجھے گنج بخش کہتے ہیں حالانکہ تُو خود محتاج ہے اور تیرے پاس تو ایک دانہ تک بھی نہیں تو اس پر فخر نہ کر۔ گنج بخش رنج بخش خدائے تعالیٰ کی ذات ہے اس جیسا کوئی نہیں ہے۔

شرک نہ کر۔ جب تک جان میں جان ہے اسے وحدہٗ لاشریک خیال کر۔

اپنے آپ کو پردیسی اور مسافر جان کہ افضل البشر پیغمبر اور محبوب خالق اکبر نے کہا ہے دنیا میں یُوں رہو جیسے تم پردیسی ہو یا مسافر۔

اے دوست! دنیا پانی کی کشتی ہے اور بن پانی کا ملک۔ تُو غوطہ خور بن ڈوبنے والا

نہ بن۔ وُہ کر جس سے کسی کو تجھ سے فیض ملے، وُہ نہ کر جس سے کسی کا دِل دُکھے۔ دین پناہ بادشاہ کی صفت یہ ہے کہ وہ جور و ستم کا قلع قمع کرنے والا اور رعیت کے نفع نقصان کو جاننے والا ہو۔ دنیا نہ ڈھونڈھ، دنیا مردار ہے اس کا طلب گار کُتّا بیان کیا گیا ہے اور عقبیٰ کا طالب بھی نہ بن اسے بھی عذاب جان، رضائے مولیٰ کا طالب بن کیونکہ رضائے مولیٰ از ہمہ اولیٰ ہے۔ حرص اور لالچ بے کار ہیں۔ انھیں ذلّت سمجھ اور طمع نہ کر جس شخص نے قناعت کی، عزّت پائی۔ طمع کرنے والا ذلیل ہُوا۔

اے علی! خاک ہو جا تاکہ اکسیر بن جائے۔ جس شخص کا روشن شریعت پر انجام بخیر ہُوا وُہی نیک آدمی ٹھہرا۔ نور ہی نور شیطان سے دُور۔

پھر کہتا ہُوں کہ اگر تجھے نور اور سرور درکار ہے تو اپنے تئیں خاک کر دے تاکہ تُو نیک اولاد اور نیک بیٹا گِنا جائے۔

اے علی! تُو نے اتنے سفر کیے مگر دو ملعونوں کو تُو نہ پہچان سکا۔ معلوم ہُوا تُو نے کچھ نہیں دیکھا اب خاک ہو جا اور باطن دیکھ لے۔

اے علی! تو عجیب دلستان، یوسف کنعان اور جان جہاں ہے۔ تُو ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے لیکن تُو نے کیا پڑھا کہ تُو گھبرایا ہوا ہے تُو نے خود سے "دشمنوں" کو دُور نہیں کیا ہے اور اپنے اُوپر گناہوں کی گرد جمنے دی ہے اور 'جوہر' کو خود صاف نہیں کیا ہے۔

اے علی دل میں عمارت بنا ذکر الٰہی کی کچّی پکّی اینٹوں سے عمارت بنا ورنہ ہر عمارت ڈھے جاتی ہے۔

اے علی! تُو عقلمند ہے، بالغ ہے، ولی ہے، صاحبِ تاج و تخت ہو کر

فقر فقیری کے تخت پر آرام کرنے والا ہے ۔نیکی کا درخت لگا تا کہ اس کا پھل تجھے ملے ۔
تو پیر ہے ، دلپذیر ہے ، بادشاہ کا وزیر ہے تو اس کا تقاضا یہی ہے کہ ، اپنی وزیری کو
خاک میں ملادے دگیری اختیار کرتے ہوئے ۔

اے علی ! تُو بادشاہ ہے تو مچھلی کی طرح مت چھپ ۔ تُو مردِ راہ اور شیر دلیر ہے
تو گھاس کا تنکا نہ بن ۔ دیکھو ایسا نہ ہو کہ تجھے رُوسیاہی نصیب ہو اپنے آپ کو خاک کر
تاکہ مردِ خدا بن جائے ۔

اے علی ! تُو بلند مرتبہ سُورج ہے ، بلند آسمان ہے بلکہ سُورج رکھنے والا آسمان ہے
مگر تو خاک ہو جا تا کہ مردِ پر نُور کہلائے ۔

اے علی ! تیرے پاس ہیرے موتی ہیں ۔ تُو خود کو مالک سمجھتا ہے تو صرف
امانت دار ہے ۔ دیکھ تو اپنے شہر میں ذلّت نہ اٹھانا ۔

بڑھیا کی طرح حرص ولالچ نہ کر ۔ خدا سے موافقت کر ۔ اس کے کرم پر ناز کر ۔
راز مت کھول ۔ نماز قضا نہ کر ، تو کامل عامل ہے ۔ امانت کا حامل ہے ۔ تُو نیک بخت ہے
اور آخرت میں سختی نہیں چاہتا ۔

اے دوست ! تُو میرے جگر کا ٹکڑا ہے ۔ ان باتوں پر عمل کر ۔

اے علی ! باتیں بیکار ہیں ، اپنا کام کر ، عقلمندوں سے نہیں سُنا کہ تعلقات
توڑ ۔ واصلِ حق بن اور سوائے خدا کے کسی کو نہ ڈھونڈھ ۔

میں علی بن عثمان جلابی ہُوں ۔ مجھے عجیب وغریب باتیں معلوم ہیں ۔ میں سوائے
محبوب کے کسی سے پیار نہیں کرتا اور اس کے دیدار کے سوا مجھے اور کوئی کام نہیں ۔
اس کے نام کے علاوہ میرا کوئی ورد وظیفہ نہیں ۔ میں اس کے چاند سے جادو والے

چہرے کو کبھی اس کے رخساروں کو دیکھتا ہوں، کبھی اس کی خاک راہ کو حقیقت بیں آنکھ کے لیے سُرمہ کرتا ہوں۔ اس کے نقش کف پا کو بدر سمجھتا ہوں اور اس کے دانتوں کی لڑی پر جان نثار کرتا ہوں۔ اس کے سروِ رفتار سے فکر روشن کرتا ہوں۔ رات بھر اس کے عشق کی غمخواری ہے اور دن بھر محنت وزاری۔ میں نے دل کو یوں اس پر قربان کیا کہ بالکل بدل گیا ہوں۔ کپڑے پھاڑ کر عُریاں ہو گیا۔ میں خطاکار فقیر اور گنہ گار حقیر ہوں جس نے دل خدا اور اس کے رسولؐ کی یاد میں ہار دیا ہے سوائے محبت کے اُسے کوئی کام نہیں، جو دنیا کو ناپاک جگہ سمجھتا ہے اور سرائے کہتا ہے جس میں مسافر آرام کرتے ہیں، جو کبھی آسمان پر ہوتا ہے کبھی زمین پر۔ میں نے اپنے آپ کو خاک کر لیا ہے۔

اے دوست بے دل نہ ہو، عمر یادِ خدا میں بسر کر، جسم کو تکلیف دے اور سختی میں ڈال تاکہ مردِ راہِ خدا ہو جائے۔ تنہائی گراں مایہ ہے۔ ہمہ وقت مرشد کی حضوری میں رہنا چاہیے، تنہائی گراں مایہ ہے۔ ہمیشہ مرشد کی حضوری میں رہ کر مزاروں پر وظیفہ اور فاتحہ خوانی کر۔ یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھ۔ یہ فرض ہے ——— نماز با جماعت ادا کر اور دل لگا کر وضو کر۔

میں نے اشعار بہت لکھے ہیں۔ میں نے بہت اچھا دیوان لکھا جسے اچھے آدمیوں نے پسند کیا۔ اس دیوان میں یہ غزل بھی ہے (ترجمہ):

۱۔ دن کو مجھے تیری آرزو رہتی ہے اور رات کو تیری محبت، چھپ کر بھی اور ظاہر میں بھی تیرے ہی عشق کا اظہار کرتا ہوں۔

۲۔ میں تیری گلی میں اپنی جان دے دوں گا خواہ اس کے نتیجہ میں مجھے تکلیف پہنچے یا مصیبت ٹوٹے۔

۳- تیرے عشق نے میرے دل و جان میں گھر کیا ہوا ہے میں ہر طرف تیرے ہی
عشق کے چرچے کر رہا ہوں۔

۴- اے خدا رقیبوں کو ختم کر دے یا مجھے یاد میں اس قدر محو کر دے کہ مجھے ان
کی پرواہ نہ رہے۔

۵- میرے پیالے میں اپنے دوست کی شراب ہے۔ تو اسے مجھ پر مہربان بھی
کر اور اسے میرا مبتلا بھی کر دے۔

۶- کتنی عجیب بات ہے کہ میں تجھ سے دید کی خواہش کروں۔ اگر تیری عادت
ہاں کرنے کی ہے تو پھر مجھ سے بھی انکار نہ کر۔

میں کہتا ہوں خدا کی تعریف ہر دم کرنی چاہیے کیونکہ وہی پشت و پناہ ہے وہی
فریاد رس ہے۔

اے دوست! میں اور تو پردیسی ہیں۔ دُعا کر کہ خدا ہم پر کرم کرے اور اپنی یاد کا
ذوق عطا کرے۔ میں بے چارہ نہاں و آشکارا آوارہ ہوں اور ہر دم محبوب کا نام جپتا ہوں۔

اے دوست! میں نے بہت دنیا دیکھی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے نیک اولاد
مانگ اگر مجرّد رہنے کی طاقت ہے اور سمجھتا ہے کہ ڈگمگائے گا نہیں۔ تو شادی نہ کر
کیونکہ یہ بڑی بلا اور عذاب ہے۔ میں نے لاہور میں دیکھا اور خود سُنا کہ ایک تاجر
کریم اللہ نامی تھا۔ اس کے گھر میں سونا چاندی اناج کی طرح بھرا ہوا تھا۔ اس کے
ہاں بچہ پیدا ہوا، جس کا نام امام بخش رکھا گیا۔ اسی روز اس کا مال چوروں نے
رستہ میں لوٹ لیا۔ اس نے خبر سُنی اور پروا نہ کی۔ دوسرے دن زیادہ بُری خبر
آئی۔ غرض چند برسوں میں اس کا مال و اسباب برباد ہو گیا اور وہ گھر سے روپیہ کمانے

نکل گیا مگر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ اس کی بیوی نے چکّی اٹھائی اور بازار بیچنے نکلی اور چار دام میں بیچ دی۔ پھر وُہ اس سے بگڑ گئی۔ لڑکا آوارہ ہوگیا۔ سوداگر مفلس قلاش پردیس میں مرگیا۔ بچّہ کا یہ حال ہُوا۔ بے مروّت بیوی بھی چل بسی غرض کہ دنیا خوشی کی جگہ نہیں ہے بلکہ دردِ سر ہے۔ اگر وُہ آدمی تنہائی میں بسر کرتا تو خراب نہ کرتا مگر اللہ کی تقدیر ہی ایسی تھی خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ ہمیں دم مارنے کا ٹھکانہ نہیں۔ وُہ آقا ہے، ہم اس کے بندے ہیں۔

یا اللہ علی کی عاجزی پر رحم کر اور بہ طفیل نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اسے بخش۔ اس پر رحم کر، وُہ عاجز و بیکس ہے۔ اس کا کوئی یار و مددگار نہیں ہے۔ وہ تیرے سوا کسی کو نہیں چاہتا اور تیرے نام کو جپتا ہے۔ غربت کے سوا اس کے ہاتھوں میں کچھ نہیں ہے۔ خدایا بے کس پر رحم کر۔ تُو رحیم ہے، حلیم ہے، شفیق ہے۔ میں گناہ کے سمندر میں ڈوبا ہُوں تو بخشش کر۔

اے انسان طالبِ حق بن، تکلیف سے نہ ڈر۔ فقیری مشکل ہے۔ علم سیکھ، عمل کر۔ والدین کی خدمت کر تاکہ منزل پر پہنچے۔ ان شاء اللہ صدر نشین ہوگا خدا کا کرم تیرے شامل حال ہوگا۔ خدا کی تعریف ہر دم کر۔ وہ علیم و حکیم ہے۔ بار خدایا میرے گناہ ڈھانپ۔ مجھے خواری نہ دے میں حقیر پر تقصیر عاجز ہوں۔ اے بصیر مجھ پر رحم کر میں کم زور ہوں اور تو قادر و توانا۔

اے دوست! خدا جو عنایت کرتا ہے اس پر راضی رہ، اگر ویرانہ دے اس میں رہ۔ شہر دے تو وہاں رہ، وطن یا بے وطنی سب پر راضی ہو۔ وُہ گدڑی دے یا قاقم، شکر بجالا۔ گھوڑا ہو یا گدھا، سوار ہو۔ بنعمت ربّک فحدّث، اس پر

سند ہے۔ تکلیف میں صبر کر کیونکہ خدا صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے صبر نعمت ہے
اس کا اظہار کسی پر نہ کر۔ یہ آقا کا شکوہ ہو گا۔ جو چاہے خدا سے مانگ۔ ہم سوائے خدا کے
اور فریادرس نہیں رکھتے۔ کسی کو عبادت اور استعانت میں اس کا شریک نہ کر تو
ایاك نعبد و ایاك نستعین پڑھتا ہے ورنہ تو منافق ہے یا مشرک ——
خدا اس سے بچائے۔ اور تجھے سوائے خدا کے اور کوئی نہیں بچا سکتا۔

اے دوست! میری باتوں کا بُرا نہ ماننا، غصہ نہ کرنا کیونکہ میں نے درست
بات کہی ہے۔ بر رسولاں بلاغ باشد وبس تجھے چاہیئے کہ عمل کرے اور میرے لیے
دُعا کرے۔ خدایا میری کتاب کو روشنی دے اور میرے گناہوں کو بخش، جو کچھ ہے
تو ہے۔

(ترجمہ اشعار)

اے علی! اس سے زیادہ باتیں نہ کر۔ تو مردِ خدا اور نیک عادات والا ہے
تیرے عذاب یا ثواب سے متعلق سب سے زیادہ خبر تیرے خدا ہی کو ہو سکتی ہے۔

تمت بالخیر

کتابیات

کشف المحجوب — قلمی متن فارسی

کشف المحجوب — متن فارسی مطابق نقل حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی ۔ بسعی جناب احمد ربانی ۔ معہ مقدمہ اردو

کشف المحجوب — انگریزی ترجمہ گب میموریل معہ مقدمہ انگریزی پروفیسر نکلسن ۱۹۵۹ء

کشف المحجوب — اُردو ترجمہ ٔ بیان المطلوب ' حضرت مولوی فیروزالدین مرحوم ۔ فیروز سنز ۱۹۶۴ء

کشف المحجوب — اُردو ترجمہ میاں طفیل محمد اسلامک پبلی کیشنز ۱۹۶۸ء

کشف المحجوب (نسخہ سمرقند) — اردو ترجمہ ابوالحسنات سیّد محمد احمد قادری ، مقدمہ حکیم محمد موسیٰ امرت سری ، مطبوعہ المعارف گنج بخش روڈ ۔ لاہور ۔ ۱۳۹۳ھ

کشف الاسرار — متن فارسی قلمی

کشف الاسرار — متن فارسی مطبع گلزار محمدی لاہور ۱۹۱۵ء

کشف الاسرار — متن فارسی معہ ترجمہ اردو نور احمد

حیات و تعلیمات حضرت داتا گنج بخش ۔ پروفیسر عبدالرشید مطبوعات علاقائی ثقافت ادارہ معاہدہ استنبول ۱۹۶۷ء

شعرانی، نفیس اکاڈمی ۱۹۶۵ء

پنجاب اور سرحدی صوبے کے قوم قبیلے میکلیگن اور روز ج ا گورنمنٹ پرنٹنگ پریس

لاہور ۱۹۱۹ء

منتخب التواریخ ملّا عبدالقادر بدایونی اردو ترجمہ

کتاب التعرف انگریزی ترجمہ آربری کیمبرج ۱۹۳۵ء معہ مقدمہ انگریزی

تعرف اُردو ترجمہ ڈاکٹر پیر محمد حسن، مطبوعہ المعارف گنج بخش روڈ لاہور

ارمغان پاک مرتب شیخ محمد اکرام چاپ خانہ دین محمدی پریس۔لاہور

ادب نامہ ایران میرزا مقبول احمد بدخشانی اتحاد پریس لاہور

جامع التواریخ مولوی فقیر محمد مطبع نامی نول کشور اودھ اخبار ۱۸۷۱ء

سوانح عمری منصور ابن حلّاج میر نثار علی شہرت حمیدیہ سٹیم پریس ملک فضل دین

کشمیری بازار لاہور۔

اسلام صراط المستقیم مرتب کینتھ مارگن ترجمہ اُردو غلام رسول مہر

حضرت داتا گنج بخش (انگریزی) پروفیسر مسعود الحسن۔ شائع کردہ حضرت داتا گنج بخش

اکیڈیمی۔لاہور

مجلہ ہلال اشاعت مئی ۱۹۵۶ء

مقالہ سعید نفیسی

مجلہ ہلال جنوری ۱۹۷۱ء

مقالہ ڈاکٹر محمد کلیم راجشاہی یونیورسٹی

اورینٹل کالج میگزین فروری ۱۹۶۰ء مقالہ عبدالحی حبیبی

تذکرہ علی ہجویری — حکیم سید امین الدین احمد شعاع ادب اشرف پریس ۱۹۶۶ء

گنج بخش بحیثیت عالم — ایم۔ اے مجید یزدانی ادارہ علوم اسلامیہ خانم بازار لاہور

مرکزِ تجلیات — ایم۔ ایس ناز مکتبہ الکلام گوجرانوالہ نقوش پریس ۱۹۶۹ء

داتا گنج بخش — محمد وارث کامل مطبوعات چٹان اردو پریس۔ لاہور

نفحات الانس — مولانا عبدالرحمان جامی مطبع نول کشور ۱۸۷۰ء

سفینۃ الاولیا — شہزادہ محمد داراشکوہ قادری اردو ترجمہ نفیس اکاڈمی کراچی ۱۹۶۱ء

خزینۃ الاصفیا — مفتی غلام سرور لاہوری ۲ جلد نولکشور مطبع کانپور ۱۹۱۴ء

تذکرہ اولیائے ہند — میرزا محمد اختر دہلوی میو پریس دہلی ۳ جلد ۱۹۲۸ء

نزہۃ الخواطر — علامہ سید عبدالحئی حسنی ۴ جلد مقبول اکاڈمی استقلال پریس ۱۹۶۵ء

دس ولی — بشیر احمد سعدی مکتبہ جدید پریس ۱۹۶۵ء

بزرگانِ لاہور — پیر غلام دستگیر نامی، نوری بک ڈپو لاہور ۱۹۶۶ء

پاکستان میں فارسی ادب — ڈاکٹر ظہور الدین احمد یونیورسٹی بک ایجنسی استقلال پریس لاہور

بزمِ صوفیہ — سید صباح الدین عبدالرحمان، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۴۹ء

تصوفِ اسلام — مولانا عبدالماجد دریا بادی، مطبوعہ المعارف گنج بخش روڈ۔ لاہور

آبِ کوثر — شیخ محمد اکرام فیروز سنز ۱۹۵۸ء

ثقافتِ پاکستان — مرتب شیخ محمد اسلم ندوۃ المصنفین نقوش پریس لاہور ۱۹۷۰ء

الطبقات الکبریٰ — ترجمہ اردو عبدالغنی وارثی (طبقات الاولیا علامہ عبدالوہاب

نقوش لاہور نمبر	ادارہ فروغ اردو فروری ۱۹۶۲ء
اشاعت ملّی	امروز۔ مقالہ محمد اعجاز طفیل
اشاعت ملّی	امروز۔ مقالہ ایم مسعود، (حضرت داتا گنج بخشؒ)
	عشرت رحمانی، (کشف المحجوب)
	سیّد مظہر حیدر، (آفتاب ہجویر)

کتبہ: محمد شریف گل

کشف المحجوب (نسخہ سمرقند)

تصوف کی لازوال اور شہرہ آفاق کتاب

مصنف : ابوالحسن سید علی بن عثمان ہجویریؒ

مترجم : ابوالحسنات سید محمد احمد قادریؒ

حضرت داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف لطیف کشف المحجوب مسائل شریعت وطریقت اور حقیقت و معرفت کا ایک بیش بہا گنجینہ اور اولیائے متقدمین کے حالات بابرکات اور ان کی مقدس تعلیمات کا بہترین خزینہ ہے۔ یہ فارسی زبان میں تصوف واحسان پر سب سے پہلی کتاب ہے اور اسے ہر دور کے صوفیا کرام نے تصوف کی بے مثل کتاب قرار دیا ہے اس کے بار بار کے مطالعہ سے حجابات اٹھ کر نئے نئے انکشافات ہوتے ہیں۔ صاحب کتاب کے مرتبہ کمال کا اندازہ اس سے کیجئے کہ خواجۂ خواجگان معین الدین چشتی اجمیریؒ اور شیخ المشائخ فریدالدین گنج شکرؒ جیسے کاملین نے آپ کے مزار پر چلے کھینچے اور فیوض و برکات حاصل کیے۔ دونوں حضرات کے چلہ کشی کے نقوش اب تک محفوظ ہیں اور کتاب کے بارہ میں سب سے بڑھ کر قابل استناد وقابل افتخار سلطان المشائخ نظام الدین اولیاؒ کا یہ قول ہے کہ جس کا کوئی مرشد نہ ہو اس کو چاہیے کہ کشف المحجوب کا مطالعہ کرے۔ المعارف نے اس اہم اور تقریباً ہزار سال قدیم کتاب کے ایک معتبر نسخہ، نسخہ سمرقند کو پوری تصحیح وتحقیق کے ساتھ پہلی بار اردو میں پیش کیا ہے۔

آفسٹ طباعت، سفید کاغذ، اعلیٰ کتابت، نفیس جلد، حسین گردپوش، $\frac{22 \times 18}{8}$، ۶۳۲ صفحات۔

قیمت : ۱۸ روپے

- کشف المحجوب ایک ضخیم کتاب ہے۔ اور اپنے موضوع کے لحاظ سے وقیع بھی ہے اب تک اردو میں اس کے متعدد ترجمے شائع ہو چکے ہیں لیکن صحیح معنوں میں کشف المحجوب کا یہ پہلا ترجمہ ہے جو ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ (امروز، لاہور)
- کشف المحجوب کے بہت سے اردو تراجم موجود ہیں مگر ناشر حضرات نے متن اور ترجمہ کے ساتھ کبھی بھی انصاف کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی کسی مستند عالم دین سے اس کا ترجمہ کروا کر بہتر کاغذ پر شائع کرنے کی کوشش کی۔ المعارف مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے ایک صاحب ارشاد عالم کا ترجمہ بہترین کتابت و کاغذ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ (مساوات، لاہور)
- یوں تو بازار میں کشف المحجوب کے متعدد اردو تراجم دستیاب ہیں لیکن حکیم محمد موسیٰ امرتسری نے اس عظیم کتاب پر ایک طویل اور سیر حاصل مقدمہ لکھ کر اس کی اہمیت بڑھا دی ہے۔ کشف المحجوب کے مطالعہ کے لیے اس مقدمہ کا مطالعہ لابد ہو گیا ہے۔ (کتاب، لاہور)
- تصوف کی اس لازوال کتاب میں ہر دور کے لیے اپیل ہے یہی اس کا کمال ہے، کتاب المعارف نے بہت اہتمام سے شائع کی ہے۔ (نوائے وقت، لاہور)
- علامہ ابوالحسنات کے قلم زرنگار نے اس لافانی کتاب کی شہرت ومقبولیت کو کامیابی سے آئندہ نسلوں کو منتقل کر دیا ہے۔ (جنگ، کراچی)

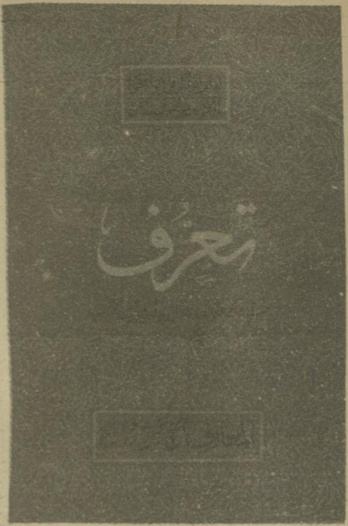

تعرّف

صوفیائے کے عقاید و احوال پر قدیم ترین کتاب

مصنف: امام ابوبکر بن ابو اسحاق کلاباذیؒ

مترجم: ڈاکٹر پیر محمد حسن

چوتھی صدی ہجری میں جب تصوف ایک نازک مرحلہ سے گزر رہا تھا اور خطرہ تھا کہ اسے خلافِ شریعت نہ قرار دے دیا جائے۔ امام کلاباذی نے اپنی مشہور کتاب التعرف لمذہب اہل التصوف لکھی اور ثابت کیا کہ صوفیاء کی تعلیم نہ صرف زندقہ و الحاد سے دور ہے بلکہ بعینہٖ وہی ہے جو ٹھیٹھ اہل سنّت کا عقیدہ ہے یہی وجہ ہے کہ کلاباذیؒ کی تعرف کو قشیریؒ کے رسالہ، مکّیؒ کی قوت القلوب، سراجؒ کی لمع اور ہجویریؒ کی کشف المحجوب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں تعرف کو صوفیاء کی تعلیمات پر ایک مستند متن تسلیم کر لیا گیا اور مشہور علماء و صوفیائے نے اس کی شرحیں لکھیں اس کتاب کی قدر و منزلت کا اندازہ شہرۂ آفاق مصنف شیخ شہید سہروردیؒ م ۵۸۷ھ کے اس قول سے ہوتا ہے کہ لولا التعرف لما عرف التصوف، اگر تعرف نہ ہوتی تو تصوف کو کوئی نہ جان سکتا۔ المعارف نے اس ایک ہزار سال قدیم کتاب کو پوری تصحیح و تحقیق کے ساتھ پہلی بار اردو میں پیش کیا ہے۔

آفسٹ طباعت، سفید کاغذ، اعلیٰ کتابت، نفیس جلد، حسین گرد پوش، ۱۸×۲۳/۸، ۲۶۴ صفحات

قیمت: ۱۵ روپے

- تعرف اکابر صوفیہ کے نزدیک معتبر اور مستند تسلیم کی گئی ہے اور اس کے معارف کو مجتہد صوفیہ نے اپنا مختار قرار دیا ہے۔ (صحیفہ، لاہور)
- یہ ترجمہ اردو زبان میں ایک اچھی اور مستند کتاب کا مفید و کارآمد اضافہ ہے۔ (فکر و نظر، اسلام آباد)
- اس کتاب میں ثابت کیا ہے کہ تصوف کتاب و سنّت سے الگ کوئی چیز نہیں بلکہ اسی سے ماخوذ و مستفاد ہے۔ (البلاغ کراچی)
- اس اہم کتاب کے ترجمہ و حواشی اور مقدمے میں محقق مترجم نے جس طرح نظر و تدبر سے کام لیا ہے اسی طرح ناشر نے بھی کاغذ، کتابت، طباعت اور تجلید و تزئین میں اہتمام کیا ہے۔ (قومی زبان، کراچی)
- اس کتاب کے مباحث سنجیدہ اور اہل بصیرت قارئین کیلئے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ (جنگ، کراچی)
- کتابِ تعرف کو اگر تصوف کا انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو یہ کوئی تعلّی نہ ہوگی۔ (نوائے وقت، لاہور)
- قرآنی حقائق کو اپنانے کا نام تصوف ہے، تعرف میں اسی کو ثابت کیا ہے اور شریعت کی تشریحات اور تصوف کی اصطلاحات کے ڈانڈے ملا دیئے ہیں۔ (سلسبیل لاہور)

آداب المریدین

آٹھ صدی سے مشائخ صوفیہ کا دستور العمل

مصنف: شیخ ضیاء الدین سہروردی

مترجم: محمد عبد الباسط

آداب المریدین شیخ ضیاء الدین ابو النجیب عبد القاہر سہروردی (۴۹۰-۵۶۲ھ) کی ایک اہم تصنیف ہے۔ زبان کی سلاست اسلوب کی شگفتگی اور نفس مضمون کی جامعیت کے باوصف اس کتاب کا شمار صوفی ادب کی امہات الکتب میں ہوتا ہے علم تصوف کے مورخین نے اسے ہر دور میں ایک وقیع ماخذ قرار دیا ہے اور یہ بجا طور پر قدماً صوفیہ کے عقاید و احوال، سلوک و تصوف اور بود و باش پر ایک گرانقدر اور مستند دستاویز ہے۔ اس کی روحانی عظمت کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ گزشتہ آٹھ سو سال سے اسے مشائخ صوفیہ کے دستور العمل کی حیثیت حاصل ہے جو مبتدی اور منتہی سالکین کے لیے یکساں طور پر تزکیۂ باطن، تربیتِ نفس اور تکمیل منازل میں مشعلِ راہ رہا ہے۔ متعدد اکابر مشائخ و علمائے تصوف نے شروح و تراجم کے ذریعے اس کی تفہیم و ترویج میں حصہ لیا۔ انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز حیدر آباد دکن نے اس مایۂ ناز تصنیف کا اردو ترجمہ مع افادات حضرت خواجہ گیسو درازؒ ۱۹۶۵ء میں شائع کیا تھا۔ المعارف نے یہی ترجمہ نظر ثانی اور مفید حواشی و اشاریہ کے اضافہ کے ساتھ پاکستان میں پہلی بار شائع کیا ہے۔

اعلیٰ کتابت، نفیس جلد، آفسٹ طباعت، آفسٹ کاغذ، حسین گرد پوش، ۲۳×۱۸/۸

۱۶۰ صفحات۔

قیمت: ۱۰ روپے

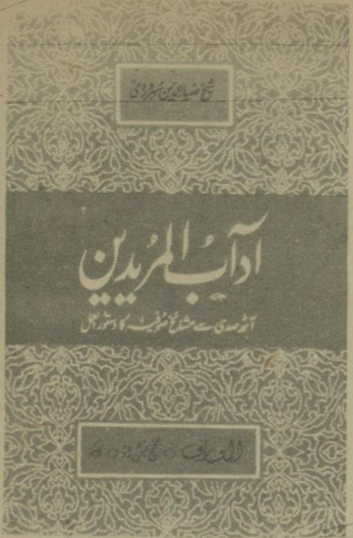

● آداب المریدین کس قدر اہم کتاب ہے اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ ایسی جامع شخصیت نے اس کتاب کی عربی و فارسی میں کم از کم چار شرحیں لکھنا ضروری خیال کیا اور ہر طبقہ کے صوفیہ نے اسے مریدین کاملین کے لیے دستور العمل قرار دیا۔ اس کتاب میں بھی المعارف نے اپنا معیار پوری طرح برقرار رکھ کر قارئین تصوف کو اظہارِ تشکر کا موقع دیا ہے۔ (مساوات، لاہور)

● آداب المریدین وہ نایاب، نادر اور قدیم کتاب ہے جو عرصہ سے ناپید تھی جسے اب المعارف نے نشستہ و رواں اردو ترجمہ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کتاب کی افادیت کے لیے ایک فقرہ درکار ہے۔ مختصراً اس میں صفات الٰہی، قرآن کے متعلق عقیدہ، جنت و دوزخ، خلق افعال، قضا و قدر، کسب تجارت، آداب لباس و ملاقات اس نوع کے بیالیس عنوانات ہیں جنہیں بکمال اختصار اس انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ بات بخوبی سمجھ آجاتی ہے۔ (نوائے وقت، لاہور)

● بیشک یہ کتاب بڑی اخلاق آموز ہے اور صحیح تصوف کی تلقین کرتی ہے اردو ترجمہ سلیس اور رواں ہے۔ مترجم نے جن بزرگوں کا ذکر کتاب میں کیا ہے حاشیے میں بڑی محنت سے انکے حالات جمع کر دیئے ہیں کتاب بڑی خوش سلیقگی سے چھاپی گئی ہے جس پر ناشرین مستحق تعریف ہیں (امروز، لاہور)

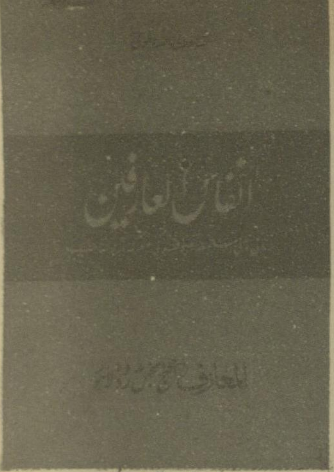

انفاس العارفین

ولی اللہی سلسلۂ تصوف کی معرکہ آرا کتاب

مصنف: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح

مترجم: سید محمد فاروق القادری

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رح کی عظیم شخصیت متاخرین علماء و صوفیاء میں بہت بلند مقام رکھتی ہے۔ آپ نے زوال پذیر امت مسلمہ کی نشاۃ ثانیہ کے لیے اپنے علم و عمل اور فکر و حکمت کے ذریعہ جو مساعی جمیلہ کی وہ ہر دور کے لیے باعث رشد و ہدایت ہے، اسی لیے تمام مکاتبِ فکر باہمی اختلافات کے باوجود شاہ صاحب کا احترام کرتے ہیں اور ان کی تعلیمات کو مشترک سرمایۂ دین سمجھتے ہیں۔ انفاس العارفین بظاہر ایک خاندانی تذکرہ ہے لیکن درحقیقت ولی اللہی فکر و حکمت کا بیش بہا خزانہ اور اس خاندان گرامی کے معمولات و اعتقادات کا گنج گراں مایہ ہے۔ یہ آخری دور کی تصنیف ہے، اس لیے اپنی جامعیت اور شگفتگیٔ بیان کے اعتبار سے شاہ صاحب کی دوسری کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے اگر شاہ صاحب کی شخصیت کو دین فہمی میں ایک معیار مان لیا جائے تو بلاشبہ آپ کی یہ کتاب برصغیر میں گزشتہ سو برس سے پیدا ہونے والے تمام اختلافات مٹا سکتی ہے۔ المعارف نے ولی اللہی سلسلۂ تصوف کی اس معرکہ آرا کتاب کو پہلی بار اردو میں پیش کیا ہے۔

آفسٹ طباعت، آفسٹ کاغذ، عمدہ کتابت، نفیس جلد، حسین گردپوش، ۱۸×۲۳/۸، ۴۲۴ صفحات۔

قیمت: ۲۰ روپے

• المعارف مبارکباد کا مستحق ہے کہ اس نے اس عظیم تصنیف کو پہلی بار اردو میں منتقل کرنے کا شرف حاصل کیا ہے۔ مترجم نے کتاب کو ابواب میں تقسیم کر کے اور عنوان نکال کر قارئین کے لیے آسانی پیدا کر دی ہے، ترجمہ بڑا رواں، شستہ اور ہر لحاظ سے معیاری ہے، اگر مترجم خود ظاہر نہ کرتے تو کوئی ہرگز ترجمہ کے لفظی ہونے کا گمان بھی نہ کر سکتا۔

(نوائے وقت۔ لاہور)

• ہمارے نزدیک سید محمد فاروق القادری صاحب نے اس کتاب کا ترجمہ کر کے اور المعارف نے زیورِ طبع سے آراستہ کر کے ایک بہترین دینی و ملی خدمت انجام دی ہے۔ (ضیائے حرم۔ لاہور)

• انفاس العارفین کا اردو ترجمہ پڑھ کر شاہ ولی اللہ کی غیر معمولی جامعیت جسے وہ ایک جگہ اپنی شخصیت کے تضادات سے بھی تعبیر کرتے ہیں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے وہ عقلیت کے امام ہیں اور انہوں نے اپنی بعض کتابوں میں معجزات، وحی، الہام اور عبادات و احکامِ دین کی بالکل عقلی تشریحات کی ہیں اور فلاسفہ و حکما کی طرح عقل، تجربہ اور مشاہدہ کو زندگی میں بڑی اہمیت دی ہے لیکن زیر نظر کتاب میں اپنے بزرگوں کے روحانی تصرفات و کرامات اس تفصیل سے بیان کیے ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے (امروز لاہور)